www.urducouncil.nic.in
بر 2015، قیمت: -/10روپے

ماہنامہ بچوں کی دنیا
دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام
1931-2015

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

اُردو دُنیا

ماہنامہ

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھئے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سیمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

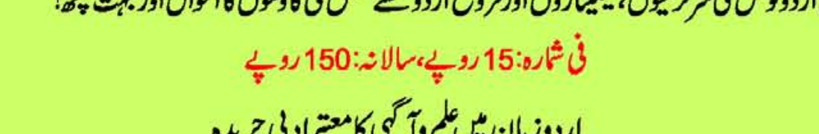

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھئے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں	مدیر	04
یوم اساتذہ پر	بچوں کے عبدالکلام	خاور حسن	05
کہانیاں	کمال کی غلطی	مظہرالاسلام	07
	ہمدرد میڈم	عطیہ بی	09
	کہانی سکّوں کی	ندیم غوری	14
نظمیں	بولتی پہیلی / اپنی اپنی بولیاں	مظفر حنفی	17
ڈراما	عادل بادشاہ	نورالحسنین	18
کہانیاں	گھر کی خوشبو	سید مرغوب احمد	23
	بدتمیزیاں	پرویز اشرفی	26
	دعوت نان ویج	ذاکر فیضی	29
نظم	ہفتے کے دن	ضیا عالم	32
نانی کا صندوق	جب چوہے پر مقدمہ چلا	کے پی سکینہ	33
	خرگوشوں کی غزل	راجہ مہدی علی خاں	35
سائنس کی الف لیلہ	کہانی نیلے رنگ کی	سکٹف اور سکٹف	36
مضمون	چھوٹی سی گڑیا کی لمبی کہانی	ڈاکٹر بانو سرتاج	41
قسط وار ناول	اُلٹا درخت	کرشن چندر	47
کامکس کہانی	علی بابا اور چالیس چور	ادارہ	55
ننھے فنکار	بچوں کی تخلیقات	ادارہ	62
نظم	عیدمنائیں	بسم اللہ عدیم	62

بچوں کی دنیا

جلد:3 شمارہ:9 ستمبر 2015

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر :ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل۔ محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی -110025
فون:49539000
شعبہ ادارت:49539009-11
ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
قیمت: /10 روپے، سالانہ/100 روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت:
ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم
نئی دہلی 110066
فون:26109746
ای میل:sales@ncpul.in
ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد -500002
فون: 040-24415194

آپس کی باتیں

عزیز دوستو! سوچا تھا اس مرتبہ آپ سے یوم اساتذہ پر بات کریں گے جسے ہر سال 5 ستمبر کو پورے ملک کے طالب علم بڑے جوش وخروش سے مناتے ہیں اور آپ کو یہ بھی یاد دلائیں گے کہ 5 ستمبر دراصل ہمارے ملک کے دوسرے صدر جمہوریہ اور عظیم فلسفی ودانش ور ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن کا یوم پیدائش ہے جسے انھوں نے اپنے جنم دن کی بجائے 'ٹیچرز ڈے' کے طور پر منانے کی خواہش ظاہر کی تھی اور یہ بھی کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کو صدر جمہوریہ ہونے کی بجائے ایک ٹیچر ہونے کی حیثیت زیادہ عزیز تھی۔

لیکن 27 جولائی 2015 کی شام ہمارا ملک اپنے ایک اور عظیم 'ٹیچر' سے محروم ہو گیا جسے دنیا اے پی جے عبدالکلام کے نام سے جانتی ہے۔ وہ ایک سائنسداں تھے۔ انھوں نے ملک کو جدید ترین میزائل ٹیکنالوجی سے آرستہ کرنے کا نہ صرف نقشہ بنایا تھا بلکہ اسے حقیقت کی شکل دے کر بھی دکھایا۔ یہی نہیں ہندوستان کو دنیا کی ایک بڑی ایٹمی طاقت بنانے میں بھی ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس شاندار کارنامے کے بعد وہ ملک کے سب سے اونچے عہدے پر پہنچے اور پانچ سال تک ہندوستان کے صدر جمہوریہ رہے۔ ایک معمولی اور بے حد غریب ملّاح کے گھر میں پیدا ہونے والے ابوالفاخر زین العابدین عبدالکلام کے محض اپنی محنت اور لگن کے بل بوتے پر راشٹر پتی بھون پہنچنے کی داستان نہ صرف حوصلہ دلاتی ہے بلکہ ہندوستانی جمہوریت کی اس خوبصورتی کو بھی سامنے لاتی ہے کہ اس میں سماج کے سب سے کمزور حصّے سے تعلق رکھنے والا شخص بھی ملک کی سب سے بڑی شخصیت بن سکتا ہے۔

مگر اتنی اہم شخصیت ہونے کے باوجود ڈاکٹر عبدالکلام کو ذرہ برابر غرور اور گھمنڈ نہیں تھا۔ سب سے زیادہ خوشی انھیں اس بات سے ہوتی تھی کہ ان کو ایک ٹیچر یا لیکچرار کے طور پر جانا جائے۔ اس کے علاوہ انھیں نوجوان طالب علموں، خاص طور پر اسکولی بچّوں کے بیچ رہنا، ان سے باتیں کرنا اور ان میں گھل مل جانا بے حد پسند تھا۔ یوں تو سب لوگ انھیں عوام کا صدر جمہوریہ مانتے تھے لیکن اس خاص لگاؤ کو دیکھتے ہوئے انھیں نوجوانوں اور بچّوں کا صدر کہا جائے تو یہ بھی غلط نہیں ہوگا۔ بچّوں سے انھیں بہت امیدیں تھیں۔ چنانچہ جب بھی وہ بچّوں اور نوجوانوں کے بیچ کسی پروگرام میں جاتے تو انہیں ایک حلف ضرور دلایا کرتے تھے۔ اس حلف کے کچھ نکتے ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔ پڑھ کر ان پر عمل کا عہد کیجیے کیونکہ یہی عبدالکلام سر کو ہمارا سب سے اچھا خراج عقیدت ہوگا۔ پڑھیے اور بلند آواز میں دوہرایئے:

- میں خوب محنت اور لگن سے پڑھوں گا
- کم از کم 10 لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھاؤں گا
- کم از کم 10 پودھے لگا کر ان کی دیکھ بھال کروں گا
- جو لوگ دکھی ہیں ان کا دکھ درد دور کروں گا
- مذہب، ذات اور زبان کے نام پر نفرت پھیلانے والوں کا ساتھ نہیں دوں گا
- میں ایک سمجھدار شہری بنوں گا اور اپنے کنبے کو سچّائی کے راستے پر چلاؤں گا

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضٰی کریم)

بچوں کے عبد الکلام

لوگ عام طور پر ڈاکٹر عبدالکلام کو 'میزائل مین' اور 'عوام کے صدر' کی حیثیت سے جانتے ہیں مگر بچے ان کو حوصلہ بڑھانے والے لیڈر اور استاد کے طور پر جانتے ہیں۔ خود عبدالکلام کو بھی اس بات سے خوشی ہوتی تھی کہ لوگ انھیں ایک استاد اور بچّوں کے صدر کے طور پر یاد کریں۔ 2002 سے لے کر 2007 تک جب وہ ہمارے ملک کے صدر جمہوریہ تھے تو شاید ہی کوئی ایسا دن جاتا ہوگا جب وہ راشٹر پتی بھون میں ملاقات کے لیے آئے ہوئے بچّوں سے نہ ملتے ہوں۔

ڈاکٹر کلام کا پورا نام ابوالفاخرزین العابدین عبدالکلام تھا۔ ان کے والد زین العابدین ایک غریب ملّاح تھے۔ ان کی والدہ کا نام آشیمہ تھا۔ کلام اپنے 7 بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ وہ 15 اکتوبر 1931 کو جنوبی ہندوستان میں تمل ناڈو کے شہر رامیشورم میں پیدا ہوئے اور وہیں انھوں نے اسکولی تعلیم حاصل کی۔ اور پھر مدراس میں جو اب چینئی کہلاتا ہے، انھوں نے انجینئیر نگ اور ائیر واسپیس کی اعلیٰ تعلیم پائی۔

وہ بہت بڑے سائنسداں تھے، کئی کتابیں انھوں نے لکھی تھیں اور ہندوستان کے 11 ویں صدر جمہوریہ تھے۔ بچوں کے لیے ان کے پاس ہر دور میں وقت تھا جب وہ سائنسداں تھے تب بھی، جب صدر تھے تب بھی اور جب صدر نہیں رہے تب بھی۔ بچے بھی ہمیشہ ان کے پرستار رہے۔ کلام کبھی بچوں کو یہ سناتے کہ استاد کے ہاتھوں کتنی باران کی پٹائی ہوئی، کبھی یہ بتاتے کہ بہت چھوٹی عمر میں انہوں نے اخبار بھی بیچا ہے۔ وہ بچوں کو اپنی ناکامیوں کی کہانی بھی سناتے اور پھر یہ بھی بتاتے کہ وہ کامیاب کیسے ہوئے۔ کچھ باتیں وہ بچوں کو ضرور سکھانا چاہتے تھے۔ مثلاً، 'ناکامی کو سیکھنے کا پہلا موقعہ' سمجھو، اور کسی کوشش کو کبھی ختم نہ جانو۔ لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی سکھاتے تھے کہ 'اپنی پہلی کامیابی کے بعد آرام مت کرو، کیونکہ دوسری بار اگر تم ناکام ہوگئے تو بہت سے لوگ یہ کہنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں کہ پہلی کامیابی تمھیں بس قسمت سے ملی تھی۔' اکثر ڈاکٹر کلام بچوں سے حلف لیا کرتے تھے کہ وہ ان کی باتوں پر عمل کریں گے، ہمیشہ اچھا سوچیں گے اور ناکامی سے کبھی مایوس نہیں ہوں گے۔

عبدالکلام یہ مانتے تھے کہ طالب علم کو سوال کرنا چاہیے، اس لیے بچوں کے سوال سن کر اور ان کے جواب دے کر وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ وہ خود بھی بچوں سے سوال کیا کرتے تھے تاکہ ان کے جواب جان سکیں۔ ان کے لیے بچے بہت قیمتی تھے۔ ان کو لگتا تھا کہ وطن عزیز ہندوستان کی ترقی کے لیے بچوں کا پڑھنا لکھنا اور مختلف کاموں کو بہتر اور نیا کرنا بہت ضروری ہے۔ وہ صدر تھے تب بھی بچوں سے ملنے کے لیے ان کے پاس کافی وقت ہوتا تھا۔ ایک رپورٹ کے مطابق، صدر رہتے ہوئے انہوں نے 40 لاکھ بچوں سے ملاقاتیں کی تھیں۔

اے پی جے عبدالکلام نے کبھی اپنے ماں باپ، ٹیچروں، دوستوں کو بھلایا نہیں تھا۔ وہ یہ مانتے تھے کہ انہوں نے محنت ضرور کی مگر تحریک دینے اور حوصلہ بڑھانے والے کئی لوگ تھے۔ پہلے انہوں نے فائٹر پائلٹ بننے کا خواب دیکھا تھا، نہیں بن سکے مگر میزائل مین بن گئے۔ 'ترشول'، 'پرتھوی'، 'آکاش' جیسے کئی میزائل بنا کر ہندوستان کو مضبوطی دی۔ ہندوستان نے اپنا سیٹیلائٹ خلا میں قائم کیا تو اس میں بھی ڈاکٹر کلام نے اہم رول ادا کیا۔ 1998 میں پوکھرن میں ہندوستان نے جو ایٹمی دھماکہ کیا تو اس میں بھی ڈاکٹر کلام نے تعاون دیا مگر کیا وہ ایک دن میں اتنے بڑے آدمی بن گئے تھے؟ نہیں۔ خود ڈاکٹر کلام نے لکھا ہے کہ جب وہ پانچویں کلاس میں تھے تو ان کے ایک ٹیچر سیوا سبرامنیا ایئر تھے۔ ایک دن 65 بچوں کی کلاس میں وہ بتا رہے تھے کہ 'چڑیا اڑتی کیسے ہے؟' ان کے ٹیچر نے بلیک بورڈ پر ایک چڑیا بنائی جس کی ایک دُم، پنکھ اور سر بنائے اور یہ سمجھایا کہ چڑیا اڑتی کیسے ہے۔ اسی دن وہ بچوں کو رامیشورم کے ساحل پر لے گئے اور اڑتی ہوئی چڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''دیکھو! چڑیاں اپنے پنکھوں کو کیسے اوپر نیچے کرتی ہیں۔ اور اب دیکھو، وہ سمت بدلنے کے لیے کیسے اپنے پنکھ اور دُم کا استعمال کرتی ہیں۔'' کچھ اور باتیں بتا کر ٹیچر نے بتایا کہ ٹھیک یہی اصول جہاز کو اڑاتا ہے۔ ڈاکٹر کلام کے مطابق، اسی دن انہیں زندگی کا مقصد مل گیا کہ انہیں کیا بننا ہے۔ بچوں سے وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ وہ اپنا مقصد طے کریں اور جانیں کہ انہیں کیا کرنا ہے اور پھر اسی حساب سے تیاری کریں۔

بچوں اور نوجوانوں کو ڈاکٹر کلام کی باتیں سمجھ میں آتی تھیں، کیونکہ وہ اپنی بات آسان اور سیدھی سادی زبان میں کہتے تھے۔ مطلب یہ کہ ان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ بڑی باتوں کو آسان لفظوں میں کہہ دیا کرتے تھے، جیسے انہوں نے ایک بڑی بات یہ کہی کہ مصیبت آئے تو اس سے بچنے کے لیے سہارا مت ڈھونڈو بلکہ اس پر حاوی ہو جاؤ۔ پھر انھوں نے کتنے اچھے انداز میں چڑیوں اور عقاب کی مثال دے کر سمجھائی ہے کہ 'بارش میں ساری چڑیاں سایہ تلاش کرتی ہیں مگر عقاب بارش سے بچنے کے لیے بادلوں سے اوپر اڑتا ہے۔''

بچوں اور نوجوان طالب علموں سے انھیں اتنی محبت تھی کہ ان کے پروگراموں میں جانے کے لیے ہمیشہ تیار ہو جاتے تھے۔ یہی محبت انھیں میگھالیہ کی راجدھانی شیلانگ کے آئی آئی ایم IIM کے طلبا کی تقریب میں لے گئی جہاں 27 جولائی 2015 کی شام زندگی کی آخری سانس لی اور بچّوں کے ساتھ رہ کر ہی دنیا سے رخصت ہوئے۔ آج وہ ہمارے بیچ نہیں ہیں لیکن ہندوستان کے بچّوں کے دلوں میں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

Md Khawar Hasan
E-11/75A, 2nd Floor (Left Side)
Khirki Extension, Malviya Nagar
New Delhi - 110017

یوم اساتذہ پر

مظہر الاسلام

کمال کی غلطی

یوم اساتذہ کی تیاریاں زوروشور سے ہورہی تھیں۔ یہ دن ہر سال بڑے جوش وخروش سے منایا جاتا ہے۔ کئی اسکولوں میں تو میلہ بھی لگتا ہے۔ اس سال بھی کچھ ایسا ہی منظر تھا۔ جگہ جگہ ہاتھ سے بنائی گئی چیزیں پھول، ہار، گجرے اور کھیل کا سامان وغیرہ زیادہ دلچسپی بچے شوٹنگ میں لے رہے تھے۔ چائے، کافی، پھل ہر چیز دستیاب... یہ سب اس لیے کہ اس سے کمائی گئی رقم اسکول کی ایک بچی کے علاج کے لیے مہیا کرنی تھی۔ ہر چیز اپنی جگہ لاجواب! زیادہ تر لوگ تصویری نمائش میں دلچسپی لے رہے تھے۔

نہ جانے کمال کو کیا سوجھی ایک پینٹنگ پر کالا برش چلا کر حلیہ بگاڑ دیا۔ یہی پینٹنگ لوگوں کی توجہ کا مرکز تھی اور دیکھنے والے کہہ رہے تھے۔ ''واہ کیسی اچھی تصویر ہے'' کیا اتنی چھوٹی سی عمر میں ایسی خوبصورت تصویر بنائی جاسکتی ہے؟ کچھ لوگوں کو شک تھا۔ مگر یہ سچائی تھی۔ لیکن اب تو رچا کی محنت پر پانی پھر گیا تھا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی سب کی زبان پر بس ایک سوال تھا۔ ''یہ سب کس نے کیا؟'' کچھ دیر بعد معلوم ہو ہی گیا۔

میڈم جولیا نے سخت نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کڑک دار آواز میں پوچھا ''بتاؤ یہ سب کیوں کیا؟ کیا بگاڑا تھا تمہارا اس

بچی نے؟ تمہاری نادانی سے ساری محنت بیکار ہوگئی۔ جانتے ہو پینٹنگ بنانے میں کتنی محنت لگتی ہے؟ کس قدر پریشانی کا کام ہے...اور تم...تم تو ایک لائن سیدھی نہیں کھینچ سکتے۔''

کمال ندامت سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ سوری میڈم۔

سوری کہنے سے کیا حاصل ہوگا؟ یہ لفظ کہنا تمہارے لیے بہت آسان ہے۔ اگر واقعی تم نادم ہو تو جاؤ رچا سے معافی مانگو اور آئندہ اس طرح کی حرکت نہیں کروگے۔ جاؤ اب کل اسمبلی میں سب کے سامنے تمہیں اپنی غلطی ماننی ہوگی اور پھر تمہاری

سزا طے کی جائے گی۔ میڈم جولیا نے سخت نوٹس لیتے ہوئے اگلے دن کمال سے کہا۔ ''اسی طرح کی پینٹنگ آج ہی تیار کر کے دکھاؤ''

مگر لاکھ کوشش کے باوجود وہ نہ بنا سکا۔ کمال کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

حالات کچھ کچھ پہلے جیسے ہوگئے۔ طلبا و اساتذہ پڑھنے پڑھانے میں لگ گئے۔

ایک سال بعد آج پھر یوم اساتذہ تھا۔ وہی تیاریاں وہی جوش و خروش۔ آج انٹر اسکول تصویر کشی کا مقابلہ تھا۔ جس میں کئی اسکولس شامل تھے۔ درجہ وار مختلف موضوعات پر بچے اپنی اپنی تصویر بنانے میں مشغول تھے۔ ننھے منے بچے غبارے اور پتنگ بنا رہے تھے۔ کسی نے جھولا چرخی بنائی تھی۔ کسی نے ڈوری مون اور کسی نے اسپائڈر مین! کسی کو قدرتی مناظر پینٹ کرنے کا شوق تھا۔

شام ہوتے ہوتے انعامات کا اعلان کردیا گیا۔ مہمان خصوصی نے انعام یافتگان کو انعامات اور توصیفی سند سے نوازا۔ اور اب اس لڑکے کو اسٹیج پر بلایا جاتا ہے جس نے تمام اسکولس پر بازی ماری ہے۔ وہ ہے کمال۔ درجہ ہفتم کا لڑکا۔ زوردار تالیوں کے بیچ سسٹر جولیا نے کمال کو گلے لگا لیا خوشی کے آنسو کمال کے رخساروں پر تیر رہے تھے۔

''کمال اپنی اس کامیابی پر تم کیا کہنا چاہو گے؟''

''اس انعام کی حقدار دیدی رچا ہیں۔ وہ ہی میری آئیڈیل ہیں۔ میں نے آج سے ایک سال پہلے ایک غلطی کی تھی۔ جس کا مجھے افسوس ہے۔ میں نے جان لیا کہ محنت سے کیا کچھ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنی اس غلطی سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے بیچ سب نے کمال کو تعریفی نظروں سے دیکھا اور کمال آہستہ سے خوشی اور کامیابی کا احساس لیے اسٹیج سے اتر آیا۔

Mazharul Islam
31-Bahliman, Uppercour
Bulandshahar - 203001

کہانی
عطیہ بی

ہمدرد میڈم

''کھولیے دروازہ کھولیے... کب کھلے گا کتنی دیر سے باہر کھڑے ہیں دروازہ کھلتا ہی نہیں۔ بواجی اب دروازہ کھول بھی دیجیے، ہمیں اندر آنا ہے''

''آتی ہوں آتی ہوں کیوں آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ ارے آ رہی ہوں تم لوگوں کو کیا گھر میں سکون نہیں ملتا ہے جو وقت سے پہلے ہی آدھمکتے ہو۔ یا خدا کتنا شور مچا رکھا ہے''۔

جیسے ہی بواجی نے دروازہ کھولا تقریباً دو درجن اسکولی بچے دوڑتے ہوئے اسکول میں داخل ہوئے۔ 'بواجی السلام علیکم، السلام علیکم' کی صدا سے ماحول گونج اٹھا۔ ''میڈم آ گئیں کیا؟ کہاں ہیں وہ بتایئے نہ بواجی۔''

''نہیں ابھی تو نہیں آئیں تم لوگوں کی طرح فالتو تھوڑے ہی ہیں اپنے وقت سے آئیں گی۔ چلو جاؤ اپنے اپنے کلاس

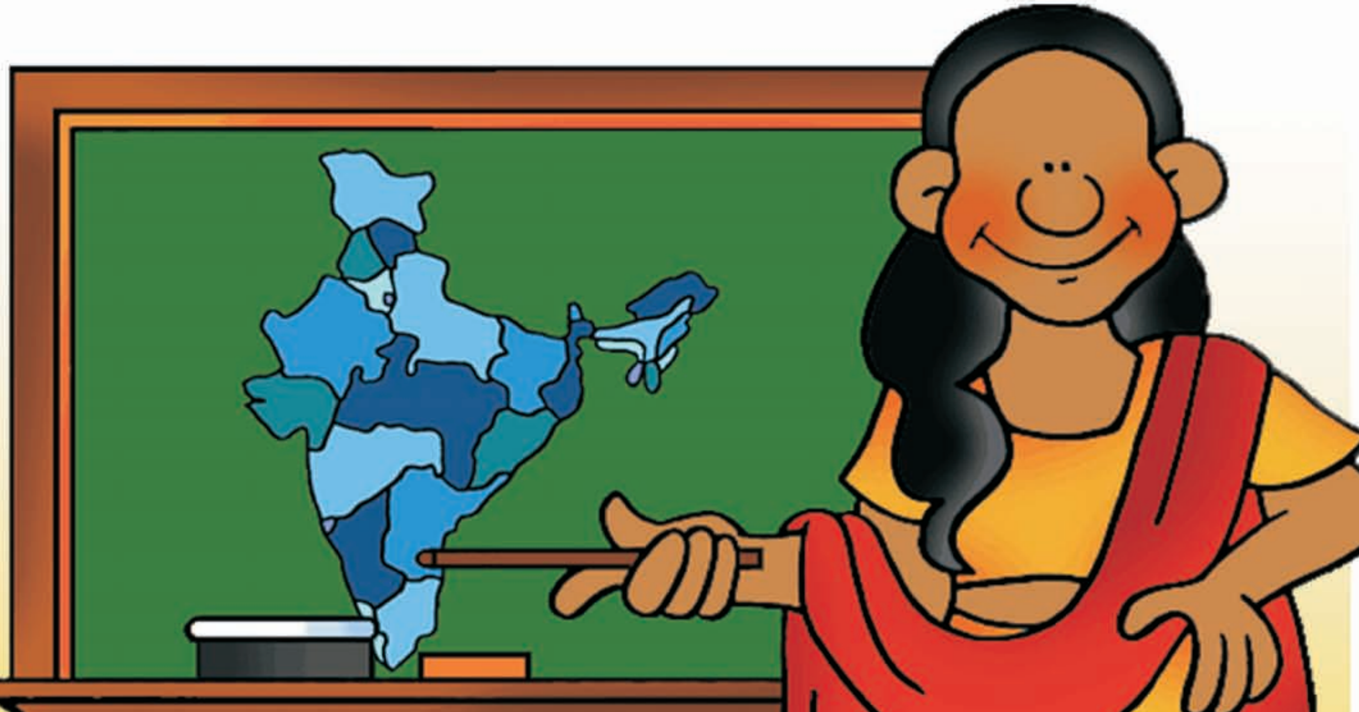

میں جا کر بیٹھو، شور کیوں مچاتے ہو"۔ نہیں بوا جی ہم کلاس میں نہیں بیٹھیں گے، ہم تو کھیلیں گے"۔

"چلو دو چار لڑکیاں آ جاؤ میرے ساتھ اسکول کی صفائی تو کرالو۔ چلو رحمت اندر رکھی دری لے آؤ اسے جھاڑ کر سامنے والی کلاس میں بچھانا ہے۔ ورنہ میڈم آ جائیں گی اور دعا کا وقت ہو جائے گا چلو چلو جلدی کرو"۔

تبھی اسکول کے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ بڑی میڈم آ گئیں، بڑی میڈم آ گئیں، کہتے ہوئے تمام بچے ان کی جانب لپکے۔

"گڈ مارننگ میڈم!" سبھی ایک ساتھ بول اٹھے۔ "گڈ مارننگ، کیسے ہو تم سب؟"

"جی میڈم ہم سب ٹھیک ہیں"۔

اسی درمیان دیگر اساتذہ بھی داخل ہوئے۔

بوا بولیں، چلو چلو جلدی سے دعا کے لیے قطار بناؤ۔" سبھی بچوں نے قطار بنا کر دعا شروع کی۔ دعا ختم ہوتے ہی سب اپنی کلاسوں میں چلے گئے اور سبھی اساتذہ بھی حاضری لینے کی غرض سے چل دیے۔ بڑی میڈم بھی درجہ پانچ میں حاضری لینے پہونچیں۔ حاضری کے دوران وہ ایک نام جو بار بار ذہن

میں ایک سوال پیدا کرتا تھا وہ نام راشد کا تھا۔'' کہاں ہے راشد وہ کیوں نہیں آرہا۔''

''پتہ نہیں میڈم کیا ہوا ہے اسے، ہم نے کتنی بار کہا اسکول چلو اسکول چلو مگر وہ آتا ہی نہیں۔ کہتا ہے مجھے اسکول نہیں جانا، کیا ملتا ہے اسکول جاکر''۔ ''اچھا! ایسا کہا اس نے'' میڈم نے بڑے تعجب سے پوچھا''۔ مگر ایسی کیا بات ہوئی کہ وہ اسکول آنے کو تیار نہیں، طبیعت تو ٹھیک ہے نا اس کی؟

''تبھی ایک دوسرا بچہ بول اٹھا۔ جی میڈم وہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ اکثر دکھائی دیتا رہتا ہے۔ جب اسکول کے لیے بلانے جاؤ تو ہاتھ جھٹک دیتا ہے کہ مجھے اسکول وسکول نہیں جانا تم ہی جاؤ۔

''میڈم بڑی حیرانی سے ان سب کی بات سن ہی رہی تھیں کہ پیچھے سے ایک دوسری میڈم نے آکر ان کی خاموشی کو توڑ دیا۔'' میڈم، چلیے آپ سے ملنے راشن والا آیا ہے۔ اسکول کے راشن کے سلسلے میں اسے کچھ بات کرنی ہے۔''

بڑی میڈم اپنا حاضری رجسٹر بند کرتے ہوئے آفس کی جانب چل دیں۔ آدھا دن گزر گیا مگر میڈم ایک عجیب سی بے چینی کا شکار دکھائی دے رہیں تھیں جس کا احساس تمام اساتذہ کو ہو رہا تھا۔ اسی درمیان ایک تیز گھنٹی کی آواز نے سبھی کا رخ باورچی خانہ کی جانب موڑ دیا۔

''چلو بھائی سبھی قطار میں بیٹھ جاؤ۔ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔'' سبھی بچے بڑے سلیقے سے قطار بنا کر بیٹھ گئے اور کھانا کھانے لگے۔ اساتذہ بھی کھانے میں مصروف ہو چکے تھے۔ مگر بڑی میڈم کبھی اِدھر جاتیں تو کبھی اُدھر۔ ان کا دل کھانے میں نہیں لگ رہا تھا اور نہ کسی اور کام میں۔ میڈم کی یہ حالت دیکھ کر سب حیران تھے کہ آج انھیں ہوا کیا ہے۔ آج سے پہلے تو میڈم کو اتنا بے چین کبھی نہیں دیکھا۔

آخر کار ایک ٹیچر پوچھ بیٹھی۔'' کیا بات ہے میڈم آپ کی پریشانی کا سبب کیا ہے؟ طبیعت ناساز ہے کیا؟''

''نہیں نہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ میں تو راشد کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ اسی کی باتوں نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔''

''ارے راشد تو پڑھنے میں بڑا ہی اچھا بچہ ہے۔ مگر پتہ نہیں کیا بات ہے کچھ دنوں سے وہ اسکول نہیں آرہا ہے۔''

''ہاں اسی بات نے تو مجھے پریشان کر رکھا ہے'' اسی درمیان دوسرے استاد بول اٹھے'' ارے میڈم یہ بچے ایسے ہی ہیں ان کا پڑھائی میں دل ول تو لگتا نہیں ایسے ہی چھٹی مار لیتے ہیں آپ بے کار ان کے لیے پریشان ہیں۔ آیئے کھانا کھایئے ان کی فکر چھوڑیے''۔ مگر میڈم کو تسکین نہ ہوئی اور وہ ناراضگی کے انداز میں ان سب کی جانب سے منہ پھیر کر میز پر رکھے ہوئے اپنے پرس کو اٹھاتے ہوئے دروازے سے باہر کی جانب تیز قدموں سے روانہ ہو گئیں۔'' کہاں جا رہی ہیں میڈم؟ کہاں جا رہی ہیں۔ ارے بتایئے تو۔۔۔

''مگر میڈم نے کسی کی ایک نہ سنی اور لمبے لمبے قدموں سے گیٹ کے باہر نکل گئیں۔ ساتھ ہی اپنے ساتھ راشد کے'' ہم جماعت بچوں کو بھی لے گئیں اور چند لمحے میں راشد کے گھر پہونچ گئیں۔

''راشد کہاں ہو تم؟ باہر آؤ میں کہتی ہوں باہر آؤ''۔ ان کی تیز آواز سن کر راشد کی والدہ باہر آئیں میڈم آپ! کیسے آنا ہوا؟ خیریت تو ہے! راشد تو گھر میں نہیں ہے آپ اندر آیئے۔

''نہیں نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں وہ اسکول کیوں نہیں آرہا ہے۔ آپ لوگ اسے اسکول کیوں نہیں بھیجتے۔''

"پتہ نہیں میڈم اب اس کا اسکول جانے کو جی ہی نہیں چاہتا دن بھر باہر پھرتا رہتا ہے۔" یہ جملہ ادا کرتی ہوئی وہ نظریں چرانے لگیں۔

میڈم کو یہ بات کچھ عجیب لگی۔ وہ واپسی کے لیے مڑتیں اس سے پہلے ہی راشد کا وہ دوست جسے وہ اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں میڈم کا ہاتھ پکڑ کر بول اٹھا "میڈم یہ سب جھوٹ بو ل رہے ہیں آپ چلیے میں آپ کو راشد کے پاس لے چلتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا، میڈم بھی اس بچے کے ہمراہ ہولیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ دونوں ایک ہوٹل کے سامنے رک گئے اس مقام پر کافی بھیڑ تھی۔ میڈم چاروں طرف نظر گھما کر دیکھنے لگی کہاں ہے راشد؟ مجھے تو کہیں دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ پتہ نہیں میڈم مجھے تو وہ اکثر یہیں ملا کرتا ہے۔ کل بھی میری ملاقات یہیں ہوئی تھی۔ اچھا رکو میں پوچھتی ہوں۔ اور وہ وہاں کھڑے کئی لوگوں سے راشد کے بارے میں دریافت کرنے لگی۔ مگر ان کے سوال کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ ہاں آس پاس کے لوگوں کا ایک مجمع ضرور لگ گیا۔ تبھی پیچھے سے ایک بھاری بھرکم آواز نے وہاں مچی افراتفری کو خاموش کرتے ہوئے کہا "کیا بات ہے اتنا ہنگامہ کیوں مچا رکھا ہے، کیا کوئی حادثہ ہو گیا ہے؟"

"ارے صاحب یہ میڈم کسی بچے کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ بڑی دیر سے پریشان ہیں۔ دیکھیے جناب کیا آپ ان کی کچھ مدد کر سکتے ہیں؟" کیا نام ہے میڈم اس بچے کا؟

اس کا نام راشد ہے۔ بھیا تقریباً دس بارہ سال کا لڑکا ہے۔ کیا آپ ایسے کسی بچے کو جانتے ہیں؟"

اسی دوران بھیڑ میں موجود ایک شخص بول اٹھا" کیوں میڈم آپ کا کچھ نقصان کیا ہے؟ اس نے پرس مارا ہے یا چوری کی ہے" وہ شخص تیز لہجہ میں بول اٹھا"۔ نہیں نہیں ایسا کچھ نہیں ہے بس مجھے اس سے ملنا ہے۔ کافی دیر سے اسے تلاش کر رہی ہوں مگر ملتا ہی نہیں۔"

" آپ پریشان نہ ہوں اسی حلیے کے ایک بچے کو میں جانتا ہوں چلیے میرے ساتھ شاید آپ کی تلاش ختم ہو جائے۔" اور وہ میڈم کو لے ہوٹل کے اندر داخل ہوا مگر یہ کیا! اس کے

قدم تو اس ہوٹل کے باورچی خانہ کی جانب مڑ گئے۔ مگر دروازے پر پہونچتے ہی قدم پتھر بن گئے۔ جس بات کی طلب میڈم کو یہاں تک کھینچ لائی تھی آج اس کے ہونے پر انہیں افسوس ہورہا تھا۔ اندر کا نظارہ دل کو تڑپادینے والا اور وجود کو تار تار کرنے والا تھا۔ وہ بچہ جو ہمیشہ نمبر ایک کی پوزیشن لے کر آتا اور ہر کام میں آگے رہتا تھا ہر ٹیچر کا نور نظر ہوا کرتا تھا آج اس کی یہ حالت دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ آنکھوں سے دریا رواں ہو گیا۔ دوسرے طالب علم نے میڈم کو ہلاتے ہوئے کہا۔ میڈم میڈم دیکھیے راشد سامنے ہے، ہم لوگ کتنی دیر سے اسے ڈھونڈ رہے ہیں اور یہ یہاں ملا۔ یہ یہاں چھپا بیٹھا ہے۔'' یہ کہتا ہوا وہ راشد کی جانب بڑھا۔

راشد جو باورچی خانے میں موجود نل کے پاس رکھے برتنوں کے ڈھیر کے پیچھے خود کو چھپائے کچھ اس طرح بیٹھا تھا کہ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی گٹھری رکھی ہوئی ہے۔ راشد اٹھو دیکھو میڈم آئی ہیں تم ملو گے نہیں میڈم سے۔ مگر راشد نے اپنا چہرہ نیچے سے نہ اٹھایا۔

''مجھے کسی سے نہیں ملنا جاؤ چلے جاؤ یہاں سے'' کیوں میرے پیچھے پڑے ہو۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

یہ کہتے ہوئے وہ اور دبک کر بیٹھ گیا جیسے کسی کی نظروں سے بچ رہا ہو۔ کب سسکیوں کی آواز چیخوں میں تبدیل ہو گئی پتہ ہی نہ چلا اسی درمیان اسے اپنے سر پر کسی مہربان کے شفقت بھرے ہاتھوں کی سرسراہٹ محسوس ہوئی اور اس کا جذبہ احساس اور زیادہ تیز ہو گیا۔ چہرہ اٹھا کر دیکھا تو میڈم کھڑی تھی وہ بے چین ہو کر میڈم سے لپٹ گیا۔

'' میڈم مجھے معاف کر دیجیے مجھے معاف کر دیجیے میں آپ کی شان میں گستاخی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر میں مجبور تھا''۔

یہ کہتے ہوئے وہ زور زور سے رونے لگا۔

''کیا بات ہے راشد کیا مجبوری ہے تم کیوں اسکول نہیں آتے؟ مجھے بتاؤ بیٹا'' راشد نے سسکیاں روکتے ہوئے اپنی زبان کھولی''

''مجھے گھر میں پڑھنے کی اجازت نہیں ہے میرا بہت دل کرتا ہے پڑھنے کا مگر گھر والے مجھے پڑھنے نہیں دیتے اور نہ ہی اسکول جانے دیتے ہیں۔''

''ارے وہ بھلا ایسا کیوں کریں گے؟'' میڈم نے بڑے تعجب سے پوچھا۔'' کیا کوئی خطا ہو گئی ہے تم سے؟''

''نہیں میڈم، وہ کہتے ہیں اسکول جانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے گھر چلانے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے ابو کی کمائی سے پورا نہیں پڑتا لہٰذا مجھے بھی ہوٹل پر کام کرنا پڑتا ہے۔ یہاں دن بھر برتن دھو کر جو پیسے ملتے ہیں وہ گھر جا کر دے دیتا ہوں۔ مگر سچ میڈم یقین کیجیے میں پڑھنا چاہتا ہوں آپ مجھے اسکول لے چلیں۔ مجھے اسکول میں ہی کہیں چھپا دیجیے۔ میں یہاں واپس نہیں آنا چاہتا۔ بولیے میڈم آپ لے چلیں گی نا اور یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں کا رکا ہوا طوفان سیلاب کی شکل اختیار کر باہر آ گیا۔

روؤ نہیں بیٹا، میں ہوں نہ! تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تمہارے گھر والوں کو منا لوں گی۔ تم آج سے روز اسکول آؤ گے اور تمہیں ہوٹل میں کام بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ آج سے تمہاری ساری ذمے داری میری، تم ضرور پڑھو گے اور ترقی کرو گے یہ کہتے ہوئے میڈم نے اسے گلے لگا لیا۔''

Atiya Bee
23/194, LP Road
Wazirganj, Lucknow

کہانی
ندیم غوری

کہانی سکّوں کی

(اُستاد جماعت میں داخل ہوتے ہیں تمام بچے ادب سے کھڑے ہوجاتے ہیں۔)

اُستاد: (بچوں کے بیٹھنے کے بعد) بچوں بتاؤ ایک چاکلیٹ کتنے روپیہ میں آتا ہے؟

بچے: جی ایک روپیہ میں۔

اُستاد: ایک روپیہ کیسا ہوتا ہے؟

بچے: جی گول ہوتا ہے اور اس پر ٹھپّہ ہوتا ہے۔

اُستاد: اور دو روپیہ؟

بچے: وہ بھی گول ہوتا ہے اور اُس پر الگ طرح کا نشان ہوا کرتا ہے۔

اُستاد: یہ روپے کاغذ کے ہوتے ہیں یا دھات کے؟

بچے: جی دھات کے۔

اُستاد: دھات سے بنے روپے کو کیا کہتے ہیں؟

بچے: جناب سکّہ کہتے ہیں۔

اُستاد: بہت اچھے تو آج ہم سکّوں کی کہانی سنیں گے (اُستاد تختہ سیاہ پر عنوان 'سکّوں کی کہانی' لکھ دیتے ہیں اور پھر پوچھتے ہیں) اگر آپ کے پاس ایک بسکٹ ہے اور آپ کے

دوست کے پاس ایک چاکلیٹ لیکن آپ چاکلیٹ کھانا چاہتے ہیں اور آپ کا دوست بسکٹ تو دونوں کیا کریں گے۔

بچے: ہم لوگ آپس میں ادل بدل کر کھالیں گے۔

اُستاد: ٹھیک اِسی طرح ضرورت کی چیزوں کو ایک دوسرے سے بدلنا بارٹر Barter کا طریقہ کہلاتا ہے۔ پُرانے زمانے میں روپیہ پیسا نہیں تھا کہ ضرورت پڑنے پر اس سے کچھ خریدا جا سکتا۔ بس ضرورت کی چیزوں کا اپس میں لین دین ہوتا تھا۔ مثلاً کوئی شخص اپنی مرغی کے بدلے کسی سے چار انڈے حاصل کر لیتا تھا تا کہ ناشتہ تسلّی سے ہو جائے۔ اُسی طرح ایک بھینس کے بدلے میں چار یا پانچ بکریاں۔ کہیں سفر پر جانا ہو تو ایک گدھے کا کرایہ فی دِن ایک جھولا چنا یا پھر گدھے کا دانہ پانی...

بچے: (معافی چاہتے ہوئے) سَر لمبے سفر کے دوران اگر گدھا بوجھ تلے دب کر مر جائے تو؟

اُستاد: ایں! تب تو گدھے کے مالک اور سوار میں بڑی تو تو میں میں کی نوبت آجاتی ہوگی اور اگر کہیں گھوڑا کرایہ پر لے لیا اور سرپٹ دوڑ میں سوار اُس پر سے لڑھک گیا تب کچھ اس طرح مار پیٹ ہوتی ہوگی کہ سوار کپڑے جھاڑ کر کھوڑے کو ہنٹر رسید کر رہا ہے اور بعد میں مالک سوار کو۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہوگا کہ چرواہا جنگل میں خاموشی سے گائے کا دودھ پی گیا اور شام کو گوالا طبیعت سے اُس کی پٹائی کر کے حقّہ پانی بند کر رہا ہے۔

بچے: (سوال کے لیے ہاتھ اُٹھاتے ہوئے) سر آجکل تو سفر کے لیے سائیکل سے لے کر جٹ جہاز اور دودھ کے لیے پیکٹ تک موجود ہیں تو پھر یہ کس زمانے کی باتیں ہیں۔

اُستاد: ارے بھئی یہ حضرت عیسیٰ سے کوئی چھ سو سال پہلے کے معاملے ہیں۔ پہلے پہل تو اِن مسّلوں کے حل کے لیے کوڑیوں کے مول اور مونگا موتی سے کام چلا لیا گیا لیکن اُن سے بھی بات نہ بنی تو مجبوراً اُس زمانے کے ہندوستانی راجاؤں نے سب سے پہلے چاندی کے سکّہ جاری کیے۔ اُن کی دیکھا دیکھی ایشائے کوچک کی حکومتوں نے بھی سکّے بنانا شروع کیے جن میں لائیڈین ملک کی حکومت کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اچھا اب یہ بتاؤ ہندوستان میں جو سکّہ جاری ہوا تھا اُسے کیا کہتے ہونگے؟

بچے: (سوچتے ہوئے) دھیلہ پیسہ کچھ کہتے ہونگے۔

اُستاد: جی نہیں۔ اُس زمانے کے سکّہ کو بھی روپیہ ہی کہتے تھے۔

بچے: (حیرت سے) اتنے پرانے زمانے سے یہ نام چلا آ رہا ہے!! مگر سر یہ نام کس نے رکھا تھا!

اُستاد: یہ نام؟ یہ نام تو ہندوستانی ہی ہے۔ دراصل دراوڑ زبان اور سنسکرت میں خوبصورتی اور حُسن کو روپ کہتے ہیں۔ یہ لفظ رِگ وید میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اِس لیے روپ سے روپیہ یعنی سب کو پیارا۔ اب اور سُنو حضرت عیسٰؑ کی پیدائش سے تین صدی پہلے ہندوستان میں موریا سلطنت قائم ہوئی۔ اُس کا پہلا راجہ چندر گُپت موریہ تھا۔ اُس نے ملک کے تمام کاریگروں کو حکم جاری کیا تھا کہ وہ چاندی کی

بھرت کے ہتھوڑوں سے کوٹ پیٹ کر سرکاری سکّے بنائیں اور شاہی خزانے میں جمع کر دیں پھر اُن پر پہیّے اور ہاتھی کی علامتیں کھدوا کر کے اُنھیں رعایا کے لیے جاری کر دیا۔ جن سے خرید و فروخت میں بڑی سہولت ہوئی۔ چندر گُپت موریا کے قابل وزیر اعظم چانکیہ نے بھی اپنی کتاب ارتھ شاستر میں سورن مدرا یعنی سونے کے سکّوں کے ساتھ ساتھ چاندی کے اِن سکّوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

زمانہ گزرتا گیا اور روپیہ کا چلّہ چلتا رہا۔ چنانچہ سولھویں صدی عیسوی میں جب ہندوستان کے صوبہ بہار کے علاقے میں شیر شاہ سوری کی حکومت قائم ہوئی تو اُس نے بھی اپنے سکّوں کا نام روپیہ ہی رکھا۔ پھر مغل بادشاہ ہمایوں شیر شاہ سوری سے جنگ ہار کر جب دریا پار کر رہا تھا تو نظام الدین سقّے نے اپنے چمڑے کے مشکیزہ کی مدد سے اُس کی جان بچائی تھی۔ جس کے بدلے میں کہتے ہیں کہ ہمایوں بادشاہ نے خوش ہو کر اپنی سلطنت میں اُسے ایک دِن کا سلطان بنا دیا تھا۔ اس سے فائدہ اُٹھا کر نظام الدین سقّے نے اپنے مشکیزہ کو کاٹ کاٹ کر گول چمڑے کا سکّہ جاری کر دیا۔

مغلوں کے بعد اٹھارویں صدی عیسوی میں انگریزی سکّے کا روپیہ جاری ہوا۔ پھر جب ہندوستان آزاد ہوا تو 1957 سے حکومت ہند نے سو پیسے کا ایک روپے والا سکّہ جاری کیا۔ اور اب تو بس روپیہ کا ہی سکّہ چلتا ہے۔ آپ لوگ تو نئے اور چمکدار سکّے چھپا کر اور سنبھال کر رکھتے ہیں یہاں تک کہ فیس میں بھی نہیں دیتے۔ ہے نا؟

(سب بچے ہنستے ہیں اور چھٹّی کی گھنٹی بجتی ہے۔)

Mustafa Nadeem Khan Ghauri
H. No: 3-10/7405/54/4
Zarina Manzil, Vrindavan Colony
Distt: Jalana - 431213 (Maharashtra)

بولتی پہیلی

ہرا سمندر
گوپی چندر
دنیا بھر ڈبیہ کے اندر
افریقہ سے
چین سے باتیں
مدّو سے نسرین سے باتیں
گردن میں
لٹکی رہتی ہے
کانوں سے لپٹی رہتی ہے
رومنگ اچھی
سرچ بہت ہے
لیکن اس میں خرچ بہت ہے

اپنی اپنی بولیاں

کوا بولے کاؤں کاؤں
بلی کرتی میاؤں میاؤں
مرغا بولے ککڑوں کوں
چڑیا کرتی چوں چوں چوں
اور کبوتر غٹروں غوں
مینڈک ٹرٹرٹر تے ہیں
جھینگر ریں ریں کرتے ہیں
گیّا بھیں بھیں کرتی ہے
بکری میں میں کرتی ہے
طوطی ٹیں ٹیں کرتی ہے
گھوڑا ہِن ہِن کرتا ہے
مچھر بھن بھن کرتا ہے
بندر خوخے خاؤں خاؤں
کُتّا بھونکے بھاؤں بھاؤں
کوا بولے...

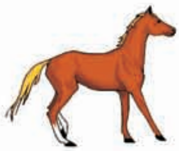

Prof. Muzaffar Hanfi
D-10, Batla House
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025

ڈرامہ

نورالحسنین

عادل بادشاہ

کردار

1۔ بادشاہ سکندر لودی
2۔ وزیر اعظم
3۔ میر عدل میاں بھوا
4۔ میاں ملیح
5۔ جاگیر دار
6۔ دوسرا جاگیر دار
7۔ پھرے دار
8۔ سپہ سالار اعظم

(جیسے ہی پردہ اُٹھتا ہے سلطان سکندر لودی کا دربار آراستہ ہے۔ بادشاہ تختِ شاہی پر رونق افروز ہے۔ امراء اور درباری عہدے کے مطابق اپنی اپنی جگھوں پر براجمان ہیں۔ بادشاہ اُن سے مخاطب ہے)

سلطان سکندر لودی: ہم بے حد خوش ہیں کہ آج ہمارے دربار میں سارے ہی صوبیدار، جاگیردار اور انتظامی اُمور کے عہدے دار موجود ہیں۔ کیا آپ تمام جانتے ہیں کہ ہم ہر ماہ اس طرح کی مجلس کیوں کرتے ہیں؟ (ایک نگاہ سب پر ڈال کر) یہ مجلس اس لیے ہوتی ہے کہ اگر ہماری رعایا کو آپ کی کسی بات

سے شکایت ہو تو وہ آپ کی موجودگی میں کہہ سکے۔

وزیر اعظم : یہ حضور کی رعایا پروری ہے۔

سلطان سکندر لودی: نہیں... یہ خوفِ خدا ہے۔ وہ جس نے ہمیں یہ عظیم الشان سلطنت بخشی ہے۔ وہ روزِ حشر ہم سے اس سلطنت کے انتظام کے سلسلے میں ایک ایک پل کا حساب بھی لے گا۔

سپہ سالار اعظم: ہم لوگ کس قدر خوش نصیب ہیں کہ اللہ نے ہمیں اتنا مہربان اور شفیق بادشاہ بخشا ہے۔

سلطان سکندر لودی : ہم بھی خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اُس نے ہمیں ایسے فرض شناس، ایماندار اور سچے عہدے دار عطا کیے ہیں۔ اب یہی دیکھیے، دربار لگا ہے۔ آپ تمام موجود ہیں، تمام رعایا جانتی ہے کہ آج جو بھی شکایت کی جائے گی وہ ہم تک ضرور پہنچے گی اور ہم اُس وقت تک دربار برخواست نہیں کریں گے جب تک فیصلہ نہ ہو جائے، لیکن اس کے باوجود کوئی فریادی نہیں ہے۔

(ٹھیک اُسی وقت ایک پہرے دار داخل ہوتا ہے۔ شاہی آداب بجالاتا ہے)

پہرے دار: حضور کا اقبال بلند رہے۔ ایک فریادی آنے کی اجازت طلب کر رہا ہے۔

سلطان سکندر لودی: اُسے فوراً حاضر کیا جائے

پہرے دار: جو حکم (شاہی آداب کرتے ہوئے چلا جاتا ہے)

سلطان سکندر لودی: (سب کی طرف دیکھتے ہوئے) خدا جانے اس مظلوم پر کس نے ظلم کیا ہے؟

تمام درباری : (ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے) ہم سب اپنے کام کاج سے مطمئن ہیں

سلطان سکندر لودی: اس بات کا ابھی پتہ چل جائے گا کہ آپ کا اطمینان صحیح ہے یا غلط (دور سے

آتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔ تمام درباری پریشان ہیں۔ بادشاہ سب کی طرف باری باری دیکھ رہا ہے)

سلطان سکندر لودی: واللہ ہم خاطی کو معاف نہیں کریں گے (سب کے چہروں پر گھبراہٹ ہے۔قدموں کی چاپ قریب سے قریب تر آتی جارہی ہے۔ یہاں تک کہ ایک غریب انسان سفید لباس پہنے آتا دکھائی دیتا ہے۔وہ دربار میں داخل ہوتا ہے لیکن اُس نے اپنے چہرے کو کپڑے سے چھپا رکھا ہے شاہی آداب بجالاتا ہے۔)

وزیر اعظم: اللہ کو حاضروناظر جان کر جو بھی کہنا ہے وہ سچ سچ کہو

فریادی: میں بعد اللہ عادل بادشاہ کے حضور لب کُشائی کی جرأت کر رہا ہوں۔اس لیے جو بھی کہوں گا، سچ ہی کہوں گا۔

سلطان سکند لودی: لیکن اے شخص یہ تو بتا، آخر تو نے اپنا چہرہ کیوں چھپا رکھا ہے۔

فریادی: میرا بادشاہ رعایا پرور اور انصاف پسند ہے لیکن میں وہ بدنصیب ہوں جو اس دربار میں شکایت لے کر حاضر ہوا ہوں۔شرم مجھے چہرہ دکھانے سے روک رہی ہے اور ضرورت زبان کھولنے پر مجبور کر رہی ہے

وزیر اعظم: اپنا نام اور مقام بیان کر

فریادی: میں سید ہوں، اور آگرہ کے قریب ایک مقام ہے اردل، وہاں کا رہنے والا ہوں۔

سلطان سکندر لودی: یعنی تیرا تعلق جاگیر دار میاں ملیح سے ہے۔بتا تجھ پر کیا ظلم ہوا؟

فریادی: حضور جاگیردار میاں ملیح نے میری زمین پر قبضہ کرلیا ہے۔میں نے اُن سے کئی بار منت سماجت کی کہ یہ زمین میرے باپ دادا کی خریدی ہوئی ہ، لیکن وہ کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں اور مجبوراً مجھے دربارِ شاہی میں شکایت لے کر آنا پڑا ۔

(بادشاہ جلال بھری نظروں سے میاں ملیح کی طرف دیکھتا ہے)

سلطان سکندر لودی: میاں ملیح! ہم تمھیں حکم دیتے ہیں کہ فوراً معززین کی نشست سے اُٹھ کر فریادی کے روبرو کھڑے ہو جاؤ۔

میاں ملیح: لیکن حضور ابھی تو یہ صرف الزام ہے۔یہ مجھ پر تہمت لگا رہا ہے

سلطان سکندر لودی: بے فکر رہو، ہم یک طرفہ فیصلہ نہیں کریں گے لیکن جب تک یہ الزام ہے تمہاری حیثیت ایک ملزم ہی کی رہے گی، لہٰذا ہمارے حکم کی تعمیل ہو

(میاں ملیح فریادی کے مقابل کھڑے ہوجاتے ہیں)

سلطان سکندر لودی: چونکہ یہ مقدمہ ہمارے ایک جاگیردار اور اُس کے علاقے کے ایک شخص کے درمیان ہے۔اس لیے فیصلہ ہم فیصل نہیں کریں گے، کہ کہیں ہم پر اپنے عہدے دار کی حمایت کا الزام نہ عائد ہوجائے۔ اس لیے ہم اس مقدمے کو اپنے میر عدل میاں بھوا کے سپرد کرتے ہیں کہ وہ تمام معاملے کی چھان بین کریں اور صحیح فیصلے تک پہنچیں۔

میر عدل میاں بھوا: جو حکم حضور بادشاہ

سلامت۔

سلطان سکندر لودی: انھیں آپ اپنے دفتر قضاۃ لے جائیں، تحقیقات کریں، اور حق بات پیش کریں۔

میر عدل میاں بھوا: (شاہی انداز میں سلام کرتے ہیں۔ اور دونوں کو اپنے ساتھ لے کر جاتے ہیں۔تمام درباری ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔)

سلطان سکندر لودی: ہم نے اپنے والدِ بزرگوار سے سنا تھا کہ جب بادشاہ اپنے جاگیرداروں اور عہدے داروں پر مالی تنگی کا سبب بنتا ہے تو اس کے عہدے دار رعایا پر اس قسم کا ظلم کرتے ہیں۔ ہم آپ تمام سے پوچھتے ہیں کیا ہم سے اس قسم کی غلطیاں سرزد ہوئیں؟

ایک جاگیر دار: ہم پر ہر طرح کی عنایتیں ہیں

دوسرا جاگیردار: حضور کی فراخ دلی کے چرچے عوام و خواص میں مشہور ہیں۔

وزیر اعظم: ہوسکتا ہے کہ میاں ملیح پر یہ ایک الزام ہو؟

سلطان سکندر لودی: کوئی سیدزادہ عام طور پر اس طرح کا غلط الزام نہیں لگا سکتا۔ ہم جانتے ہیں، سید حضرات عموماً مال و متاع کے حریص نہیں ہوتے۔

ایک جاگیردار: حضور کے اس گمان کے ہم بھی شاہد ہیں۔

سلطان سکندر لودی: یہ ہمارا گمان نہیں... یقین ہے۔

تمام: عادل سلطان کی ہر بات حق ہے۔

وزیر اعظم: تب تو میاں ملیح یقیناً سزا کے مستحق ٹھہریں گے۔

سلطان سکندر لودی: وقت کا انتظار کرو... میر عدل میاں بہوا جلد ہی آتے ہوں گے۔

(ٹھیک اُسی وقت پہرے دار حاضر ہوتا ہے۔ جھک کر شاہی سلام دیتا ہے)

پہرے دار: حضور کا اقبال بلند رہے۔ میر عدل میاں بہوا اجازت کے طالب ہیں۔

سلطان سکندر لودی: اُنھیں اجازت ہے۔

(پہرے دار شاہی آداب بجالاتا ہے اور وہاں سے جاتا ہے اور میر عدل میاں بہوا، میاں ملیح، اور سید داخل ہوتے ہیں۔)

سلطان سکندر لودی: میر عدل میاں بہوا، تمہاری تحقیقات کس نتیجے پر پہنچی۔

میر عدل میاں بھوا: سیدزادہ حق بجانب ہے۔

سلطان سکندر لودی: تفصیل بیان ہو۔

میر عدل میاں بھوا: سیدزادے نے زمین کی خریداری کے سچے دستاویز پیش کیے اور یہ بھی ثبوت پیش کیا کہ جاگیردار میاں ملیح کے قبضے سے پہلے تک وہ زمین اُسی کے تصرف میں تھی۔

سلطان سکندر لودی: (غصہ بھرے لہجے میں) جاگیردار میاں ملیح...

جاگیردار میاں ملیح: (گڑگڑاتے ہوئے) حضور مجھ سے خطا ہوئی، میں گناہ گار ہوں۔ میری خطا معاف فرمائیے۔

سلطان سکندر لودی: تاکہ دوسرے جاگیرداروں کا حوصلہ بڑھے کہ خطائیں معاف کر دی جاتی ہیں۔ ہرگز نہیں... تم نے خطا کی ہے تو سزا ضرور ملے گی۔ (بادشاہ سید زادے سے مخاطب ہوتا ہے) سید صاحب ہم آپ سے شرمندہ ہیں کہ ہمارے عہدے دار نے آپ پر ظلم کیا اور آپ کو ہمارے دربار تک آنے کی زحمت اُٹھانی پڑی۔ اُس زمین کے مالک کل بھی آپ ہی تھے اور اب بھی آپ ہی ہیں۔ (پھر بادشاہ میاں ملیح سے مخاطب ہوتا ہے)... میاں ملیح... تم نے اپنے اختیارات کا غلط استعمال کیا۔ ہماری رعایا پر ظلم کیا اور ہماری سلطنت کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔ تمہارا جرم اگرچہ بہت سنگین ہے لیکن ہم تمھیں زندہ رکھیں گے اور تمہاری جاگیر کو ضبط کرتے ہیں تاکہ تمھیں اندازہ ہو کہ ایک عام آدمی کس طرح زندگی بسر کرتا ہے۔

فریادی: میں شاہِ عادل کا تمام عمر احسان مند رہوں گا۔

سلطان سکندر لودی: دربار برخواست۔

(سب درباری کھڑے ہوجاتے ہیں۔ بادشاہ دربار سے جاتا ہے۔)

آہستہ آہستہ پردہ گرتا ہے۔

Noorul Hasnain
1-12-31, Pragati Colony
Ghati, Aurangabad - 431001
(Maharashtra)

گھر کی خوشبو

یہ کوئی کہانی نہیں بلکہ سچا واقعہ ہے۔ بات 1990 کی ہے جب میں غازی آباد میں رہا کرتا تھا۔ میا محلّہ ہنڈن ندی سے تقریباً دو کلو میٹر دور تھا۔ میں روزانہ شام کو ہنڈن ندی تک ٹہلنے ضرور جایا کرتا تھا۔ اگر آپ دہلی کے غازی آباد جائیں تو ہنڈن ندی پا کرتے ہی بائیں طرف آپ کو ایک ایکو پارک نظر آئے گا۔ یہ پارک ابھی حال میں ہی بنایا گیا ہے۔ اس سے پہلے یہاں گندا پانی رکا ہوا تھا اور پھر پانی کے دوسرے کنارے پر کھیتوں کا سلسلہ تھا۔

ایک روز گرمیوں کی شام کو جب میں ہنڈن ندی کے بہت قریب پہنچ گیا تو اچانک ایک جنگل جلیبی کے درخت پر سے منیا (Munia or Indian) کا ایک بچہ میرے قدموں کے پاس آکر گرا۔ یہ بچہ دراصل اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ اس کا جسم پروں سے ڈھک چکا تھا اور اب اڑنے کے لئے بالکل تیار تھا۔ میں یہاں یہ بتاتا چلوں کہ منیا ایک چھوٹی سی چڑیا ہوتی ہے۔ اس کا رنگ گہرا اخروٹی یا گہرا براؤن ہوتا ہے۔ اس کے سامنے یعنی سینہ پر چھوٹے چھوٹے سفید دھبے ہوتے ہیں۔ ہماری گھریلو چڑیا سے ذرا چھوٹی ہوتی ہے۔ اس کی چونچ گھریلو چڑیا یعنی گوریا سے بہت ملتی جلتی ہوتی ہے۔ چونچ اور پنجوں کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ یہ گھریلو چڑیا کی ہی طرح دانہ دنکا کھاتی پھری ہے۔ نر اور مادہ دونوں مل کر گھونسلہ بناتے ہیں۔ گھونسلہ عام طور پر گھاس پھوس، تنکوں اور پتیوں سے بنایا جاتا ہے۔ گھونسلے میں انڈے دیئے جائیں اور نر اور مادہ دونوں باری سے انڈے سیتے ہیں کو کچھ دنوں بعد جب بچے نکل آتے ہیں تو ماں اور باپ دونوں ان کے لئے کیڑے مکوڑے ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔

دراصل بچے جب ک چھوٹے اور ننگے ہوتے ہیں تب تک ان کی آنکھیں بھی بند رہتی ہیں اور چونچ بھی نرم ہوتی ہے۔ ان بچوں کو دانہ نکانیں کھلایا جاسکتا۔ اس لئے ان کے ماں باپ انہیں ایسا کھانا کھلاے ہیں جو جلد ہضم ہوجائے۔ آپ جانتے ہیں یہ کھانا کیا ہوتا ہے؟ یہ کھانا ہوتا ہے وہ کیٹر پلر یا الّیاں جو ہرے پتوں اور ہری گھاس میں چھپی رہتی ہیں اور سبزیوں اور پھول پودوں کو بہت نقصان پہنچاتی ہیں۔

رومال نکال اور بچہ پر ڈال کر اسے پکڑلیا۔ اس بچہ کو پکڑ کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور میں نے رومال کی تھیلی سی بنا کر بچہ کو اس میں رکھا اور فوراً ہی گھر واپس آ گیا۔ بچہ کے ماں باپ چیں چیں کرتے رہ گئے مگر میں نے ان کی کوئی پواہ نہ کی اور بچہ کو گھر لاکر ایک پنجرہ میں رکھ دیا۔ گھر تک آتے آتے مغرب کا وقت ہوگیا او بچہ پہلے تو پنجرہ میں چپ چپ سا بیٹھا رہا اور پھر پروں میں سر چھپا ک سوگیا۔

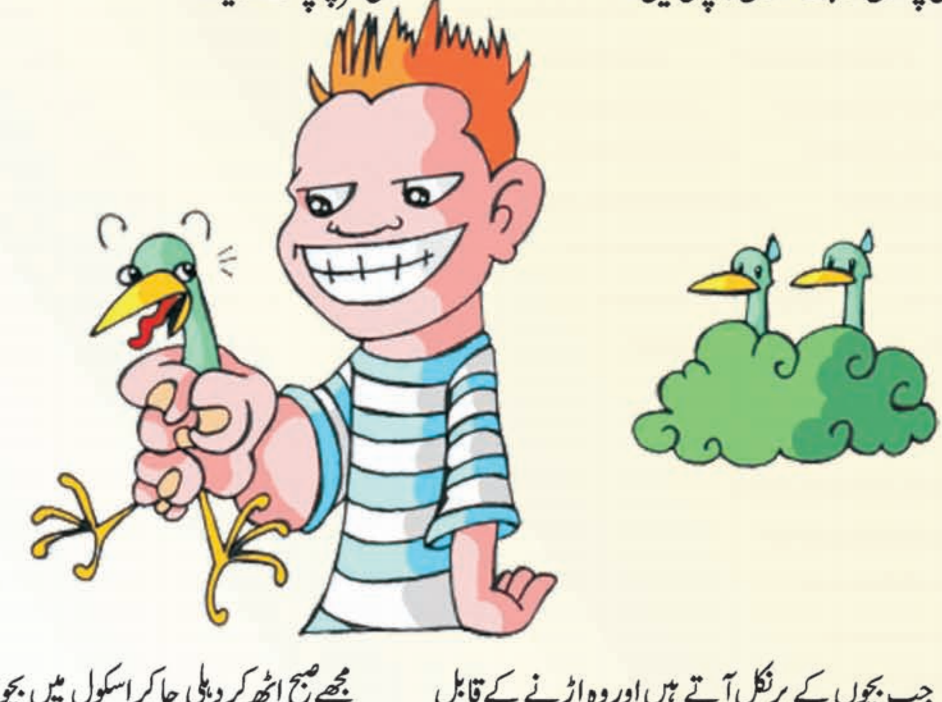

جب بچوں کے پر نکل آتے ہیں اور وہ اڑنے کے قابل ہوجاتے ہیں تو ان کی چونچ بھی سخت ہوجای ہے۔ اب ماں باپ انہیں دانہ دنکا کھلانے لگتے ہیں اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ بچے ماں باپ کے پیچھے پیچھے اڑتے پھرتے ہیں اور ماں باپ انہیں کھانا کھلاتے اور ساتھ لئے پھرتے ہیں۔

وہ مُنیا کا بچہ جو اچانک میرے پیروں کے اس آ کر گرا تھا شاید پہلی مرتبہ اپنے گھونسلے سے نکلا تھا۔ میں نے جو اس خوبصورت بچہ کو اپنے سامنے دیکھا تو جھٹ سے جیب سے

مجھے صبح اٹھ کر دہلی جا کر اسکول میں بچوں کو پڑھانا ہوتا تھا۔ میں نے بیوی سے کہا کہ اس بچہ کو آٹے کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر اور اس کی چونچ کھول کر زبردستی کھلانا۔ جب میں اسکول سے واپس آجاؤں گا تو میں یہ کام خود کرلوں گا۔

سہ پہر کو جب میں گھر واپس آیا تو بیوی نے بتایا کہ مُنیا کے بچہ نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بچہ بہت افسردہ بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے بھی آٹے کی گولیاں کھلانی چاہی تو اس نے نہیں کھائی۔ اب میرے دل میں اس بچہ سے ہمدردی پیدا

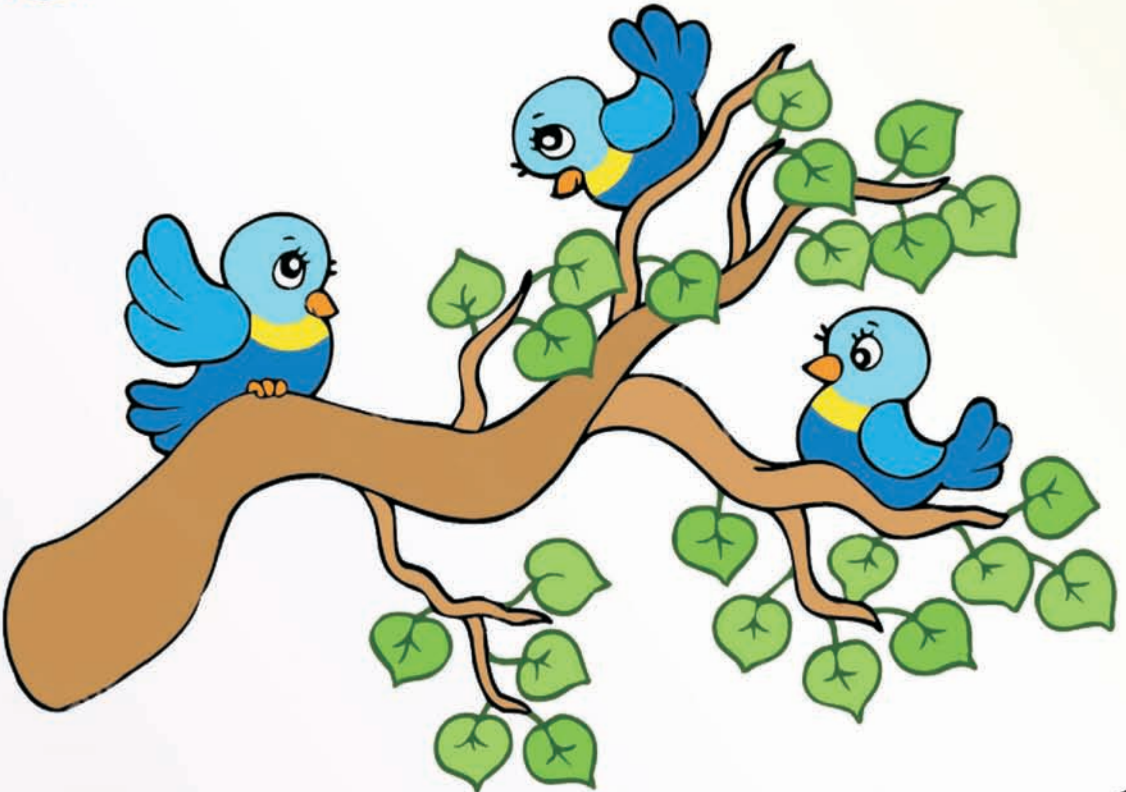

ہوگئی۔ میں نے سوچا کہ اس طرح تو مرجائے گا۔ اچھا ہےکہ میں اسے شام کو وہیں چھوڑ آؤں جہاں سے اسے لایا تھا۔

شام کو میں نے پھر رومال کی تھیلی سی بنائی۔ بچہ کو اس میں رکھا اور ہنڈن کی طرف کو چل دیا۔ جہاں سے میں نے اس پکڑا تھا ابھی اس جگہ سے میں بیس یا پچیس میٹر دور ہوں گا کہ بچہ نے رومال کی تھیلی میں سے زور زور سے چیں چیں کرنا شروع کردیا۔ پتہ نہیں اسے یہ کیسے خبر ہوگئی تھی کہ اس کا گھر قریب آگیا ہے۔ رومال بھی باریک نہیں تھا اور اس میں سے اسے کچھ بھی نظر نہیں آسکتا تھا۔ شاید اسے اپنے علاقہ کی خوشبو کا احساس ہوگیا ہو اور اس کی بو سے اسے پتہ چل گیا ہو کہ گھر قریب ہی ہے۔ بچہ زور زور سے چیں چیں کرہی رہا تھا کہ اچانک میں نے دیکھا کہ اس کی آواز سن ک اس کے ماں بلپ بھی چیں چیں کرتے ہوئے میرے سر پر منڈلانے لگے تھے

میں نے جھٹ رومال کو زمین پر رکھ دیا۔ بچہ پھدک کر بلیر نکلا اور پھر سے اپنے ماں باپ کے ساتھ اڑ کر دو کھیتوں میں چلا گیا۔

چوبیس گھنٹوں کے بعد ماں باپ کو اپنا بچہ واپس مل گیا تھا۔ جتنی خوشی انہیں ہوئی ہوگی اتنی ہی خوشی مجھے بھی ہوئی تھی۔ بچہ کو پکڑ کر مجھے جھوٹی خوشی ہوئی تھی مگر بچہ کو چھوڑ کر جو خوشی مجھے ملی تھی وہ سچی تھی۔ آج بھی جب میں اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو عجیب سی خوشی ہوتی ہے۔ اب میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اچھا کام کرکے جو خوشی ملتی ہے وہ خوشی ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتی ہے۔

Syed Marghoob Ahmad
E-100, Shaheen Bagh
Okhla, New Delhi -110025

کہانی
پرویز اشرفی

بدتمیزیاں

نادر اپنے کمرے میں موبائل گیم کھیلنے میں مصروف تھا۔ قریب ہی کمرے کی رنگائی پتائی کرنے والے عبدل چچا نادر کے کمرے میں رنگائی کررہے تھے۔

اُسی وقت نادر کی والدہ آگئیں اور بولیں۔

''میں نے تم سے کہا تھا ناکہ سدرہ کو اسکول سے لے آوَ۔ اُس کی چھٹّی کا وقت ہوگیا ہے۔ لیکن تم ہو کہ گیم کھیلنے میں مصروف ہو۔''

''امی! میں ناہیں جاؤں گا۔ بہت دلچسپ گیم چل رہا ہے۔ آپ آشو کو اسکول بھیج دیں وہ سدرہ کو لے آئے گا۔'' نادر نے بے پروائی سے کہا۔

''تم کیوں نہیں جاؤ گے؟'' والدہ ناراضگی سے بولیں۔

''آپ سمجھتی کیں نہیں، میں نے کہہ دیا میں نہیں جاؤں گا تو نہیں جاؤں گا۔'' اس بار اُس بے بدتمیزی کی۔

''ٹھیک ہے آج تمھاری شکائت تمھارے ابّو سے کرتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے کر دیجیے گا، شکایت، میں کسی سے نہیں ڈرتا۔'' نادر مزید بدتمیزی پر اُتر آیا تھا۔

کام کا وقفہ ختم ہونے کے بعد عبدل چچا اپنا ٹفن بکس لے کر ایک طرف بیٹھ گئے اور ساتھ میں پانی کی بوتل بھی رکھ لی۔ کھانا ختم کرنے کے بعد وہ آرام کرنے لیٹ گئے۔ انھوں نے نادر سے کہا ''تمھیں کہانیاں سننا اچھا لگتا ہے یا نہیں؟''

''کیوں نہیں؟ مجھے کہانیاں بہت پسند ہے۔ آپ سنائیں گے عبدل چچا۔''

''تو سنو! تمھاری عمر کا ایک نہایت اچھا لڑکا تھا لیکن اُس میں کچھ خرابیاں بھی تھیں۔ اُس کی بدتمیزی، شرارت اور ماں باپ کی بات نہ ماننے کی بُری عادت تھی۔ اس لیے محلّے والوں نے مل کر اُس کے والدین سے کہا کہ تمھارے اس بدتمیز بیٹے کی وجہ سے ہمارے بچے بگڑ جائیں گے اس لیے اس بچے کو نکال باہر کردو۔ اور دل پر پتھر رکھ کر محلّے والوں نے اُس بدتمیز بگڑیل بچے کو شہر سے ہی نکال دیا۔'' عبدل نے کہا۔

''وہ بچہ کہاں گیا، عبدل چچا؟''

''کہاں جاتا... سب نے اُس سے منہ موڑ لیا تھا اس

لیے وہ سیدھا جنگل میں چلا گیا۔'' عبدل نے بتایا۔
''ہاں! جنگل میں، بلکل تنہا؟'' نادر حیرت سے بولا۔
''تم نے ٹھیک سمجھا، وہ بلکل اکیلا ہی جنگل میں رہنے لگا۔'' عبدل نے جواب دیا۔
''عبدل چچا، جنگل میں تو خطرناک جنگلی جانور بھی ہوں گے؟'' نادر نے کہا۔
''یقیناً! لیکن جانوروں نے اُسے نقصان نہ پہنچایا۔''
'' ارے واہ! جنگل میں ایک تنہا لڑکا اور خطرناک جانوروں نے اُسے مارا نہیں ایسی کیا بات تھی اُس لڑکے میں؟'' نادر نے حیرت کا اظہار کیا۔
''بات یہ تھی کہ جنگل کا بادشاہ جنگل سے باہر گیا ہوا تھا اور وہی فیصلہ کرتا تھا کہ کس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔ کچھ دنوں بعد بادشاہ آگیا، اُس نے جب ایک انسان کے لڑکے کو دیکھا تو اپنے وزیر سے پوچھا ''یہ کون ہے؟ اور یہاں ہمارے علاقے میں کیا کر رہا ہے۔
''اس لڑکے کو محلّے والوں نے شہر سے نکال دیا ہے۔'' وزیر نے تفصیل بتا دی۔
''پھر کیا ہوا عبدل چچا...؟'' نادر سہم گیا تھا۔
''ہونا کیا تھا، بادشاہ نے لڑکے سے سوال کیا۔ محلّے والوں نے تمھیں کیوں نکالا ہے؟''
''بادشاہ سلامت! بات سچی یہ ہے کہ میرے اندر کچھ خرابیاں تھیں۔ میں بڑوں سے بدتمیزی کرتا تھا، ماں باپ کی بات نہیں منتا تھا، لوگوں کی نافرمانی کرتا تھا اور... اور کبھی کبھی جھوٹ بھی بولتا۔ لیکن میری سب سے بُری عادت ہر وقت موبائل پر گیم کھیلنے کی تھی۔'' لڑکے نے جواب دیا۔
'' اچھا! اب بات سمجھ میں آئی۔ واقعی تمھارے اندر تو

برائیاں ہی پل رہی تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ میں تمھیں سخت سزا دوں، یعنی سزائے موت۔ تم ختم تو برائیاں بھی ختم ہو جائیں گی۔'' جنگل کے بادشاہ نے سنجیدگی دکھاتے ہوئے کہا۔

''بادشاہ سلامت! کیا آپ مجھے ایک موقع نہیں دے سکتے عادت بدلنے کا؟'' لڑکے نے پوچھا۔

''کیسا موقع؟'' جنگل کے بادشاہ نے لڑکے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''اگر آپ مجھے معاف کر دیں اور گھر جانے کا موقع دے دیں تو میں اپنے والدین اور گھر والوں سے معافی مانگ لوں گا اور آئندہ کسی کے ساتھ بدتمیزی سے پیش نہیں آؤں گا۔'' لڑکے نے التجا کی۔

بادشاہ رحم دل تھا اُس نے سوچا کہ لڑکے کی بات معقول ہے۔ اسے ایک موقع ضرور دینا چاہیے۔ چنانچہ اُس نے لڑکے کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔

لڑکا گھر لوٹ آیا اور اپنے والدین اور تمام محلّے والوں سے معافی مانگ لی اور اس طرح وہ ایک نیک لڑکا بن گیا۔ اتنا کہہ کر عبدل چچا خاموش ہو گئے۔

''عبدل چچا! ایک بات بتایئے اگر وہ لڑکا نہ سدھرتا تو محلّے والے دوبارہ اُسے نکال دیتے اور جنگل کا بادشاہ اُسے سزائے موت دیتا؟'' نادر نے سوال داغا۔

''بلکل وہ تمھارے ساتھ رعایت نہیں کرتا۔'' عبدل چچا نے جواب دیا۔

نادر سر جھکا کر سوچنے لگا۔ عبدل چچا نے اسے یہی کہانی کیوں سنائی۔ جلد ہی پوری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ والدہ کے ساتھ جس طرح وہ پیش آیا تھا، اس پر اسے شرمندگی ہونے لگی۔ وہ ایک دم کمرے سے باہر نکال اور دوڑتا ہوا اپنی والدہ کے پاس پہنچ کر معافی مانگنے لگا۔ والدہ نے شفقت سے اُسے اپنے آنچل میں چھپا لیا۔!!

Parwez Alam
D-321, Dawat Nagar
Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

کہانی
ذاکر فیضی

دعوت نان ویج

مینو نے ممّی سے شکایت کی۔ ''دیکھو ناممّی! بھائی گھنٹوں سے کھیل رہے ہیں۔ ہٹتے ہی نہیں۔ بس، ابھی ابھی، کیے جا رہے ہیں۔ مجھے بھی کھیلنا ہے ممّی۔

اسکول میں گرمیوں کی چھٹیاں چل رہی تھیں۔ دس سال کا شانی صبح سے ہی کمپیوٹر پر گیم کھیل رہا تھا۔ مینو بھی کھیلنا چاہتی تھی۔ مگر شانی برابر کسی نہ کسی بہانے سے اسے ٹالے جا رہا تھا۔

''شانی اب بہت ہوگیا۔ چلو بس اب اٹھ جاؤ۔ گیارہ بج گئے ہیں۔ کچھ دیر اپنی چھوٹی بہن کو بھی کھیلنے دیا کرو'' یہ کہتے ہوئے ممّی لنچ کی تیاری کے لیے کچن میں چلی گئیں۔

شانی جھنجھلا کر اٹھ گیا۔ مینو نے شانی کو چڑاتے ہوئے کمپیوٹر پر قبضہ جما لیا۔ شانی بے دلی سے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر چند منٹوں بعد وہ کمرے سے نکل گیا۔ مینو کمپیوٹر پر گیم کھیلتی رہی۔

کچھ دیر بعد شانی جب کمرے میں واپس آیا تو اس کا دوست پرنس اس کے ساتھ تھا۔ پرنس شانی کا کلاس میٹ تھا۔ وہ اسی بلڈنگ کی اوپر والی منزل پر رہتا تھا۔

شانی اور پرنس باکسنگ باکسنگ کھیلنے لگے۔

تینوں بچے کھیل میں مشغول تھے کہ اچانک شور بلند ہوا، چند منٹ تک انھوں نے اس طرف توجہ نہیں دی، اپنے کھیل میں

مست رہے، مگر جب چڑیوں کا طوفان بدتمیزی برداشت سے باہر ہوگیا تو تینوں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ نیم کے گھنے درخت پر درجنوں چڑیاں شور مچا رہی تھیں۔ وہ ان کی حرکتوں کو غور سے دیکھنے لگے، جو پیڑ کی شاخوں پر پھدک پھدک کر اچھل اچھل کر ایک ساتھ چلا رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ مشترکہ طور پر کسی غصے کا اظہار کر رہی ہیں۔ ان کی ایکتا دیکھنے کے لائق تھی۔

جس کالونی میں پرنس شانی اور مینو رہتے تھے اس کالونی میں کئی بلڈنگیں تھی ہر بلڈنگ کے پچھلے حصے میں کئی اونچے اونچے درخت تھے۔ شانی اور مینو بلڈنگ کے فرسٹ فلور پر رہتے تھے جب کہ پرنس اسی بلڈنگ کے سکنڈ فلور پر رہتا تھا۔ شانی، مینو کے گھر کے کمپیوٹر والے کمرے میں ایک کشادہ کھڑکی تھی۔ کھڑکی کے پچھلے حصے میں کولر رکھنے کی جگہ بنائی گئی تھی، جہاں کولر رکھنے کے بجائے شانی، مینو کے پاپا روز صبح کو چڑیوں کے لیے دانہ ڈالتے تھے اور ایک برتن میں پانی رکھتے تھے۔

"بھائی آج یہ ان چڑیوں کو کیا ہوگیا ہے؟ اتنا کیوں چلا رہی ہیں اور آج انھوں نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ دیکھو سب ایسا ہی پڑا ہوا ہے"۔ مینو نے کہا۔

"پتہ نہیں۔ یہ اتنا شور کیوں مچا رہی ہیں؟

مینو نے کہا۔۔۔ کہیں یہ سب اِکٹھا ہو کر کھیل تو نہیں رہی ہیں۔ جب انٹرویل میں سارے بچے ایک ساتھ اسکول میں کھیلتے ہیں تو کتنا شور ہوتا ہے۔"

"مجھے تو لگتا ہے ان کے گھروں پر آتنک وادیوں نے حملہ کر دیا ہے۔ گِدھوں وغیرہ نے۔ اور یہ سب پروٹسٹ کر رہے ہیں جیسے سب جنتر منتر پر دھرنا دیتے ہیں، چیختے چلاتے ہیں۔۔۔ پرنس نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ وہ اپنے پاپا کے ساتھ بیٹھ کر نیوز چینل بھی دیکھتا تھا۔

"ابے ہٹ۔ یہ کوئی انسان تھوڑے ہی ہیں۔ ان کے یہاں یہ سب نہیں ہوتا کہ آتنک وادیوں نے بم سے ٹرین اڑادی۔" شانی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

اچانک شانی کی نگاہ پیڑ پر گئی، وہ اچھل پڑا۔

"ارے باپ رے! یار پرنس تو صحیح کہہ رہا ہے۔ واقعی آتنک وادی کا حملہ ہے۔"

"کہاں؟ کیا ہوا؟" پرنس اور مینو بے تابی سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگے۔

"وہ دیکھو، اوپر" شانی نے پیڑ کی ایک شاخ کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ بیٹھی ہے بلّی، آتنک وادی!"

پرنس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ آتنک وادی تھوڑی ہے۔ یہ تو آتنک وادنی ہے بھئی۔"

"لیکن یار یہ پیڑ پر کیوں چڑھی؟" پرنس نے شانی کی طرف دیکھا۔

"ارے بیوقوف! کیوں چڑھی مطلب، چڑیا پکڑ کر کھانا چاہتی ہے اور کیا؟۔ آج اس کا نان ویج کا موڈ لگتا ہے۔" تینوں

بچے ہنس پڑے۔

''چلو اسے بھگاتے ہیں۔'' پرنس نے کہا۔

''لیکن کیسے؟'' مینوایک دم فکر مند ہوگئی۔

تینوں بچوں نے ایک میٹنگ کی، جس میں طے پایا کہ بلّی کو بھگانے کے لیے اینٹوں کا انتظام کیا جائے۔

پھر بچوں نے تیزی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی اینٹیں اِکٹھا کیں اور پیڑ پر بیٹھی بلّی کو نشانہ بنانے لگے مگر ایک بھی نشانہ کامیاب نہیں بیٹھا۔ بلّی سہمی ہوئی نگاہوں سے بچّوں کو دیکھتی رہی۔ شانی اور پرنس نے بلّی کو گھور کر دیکھا۔ جیسے خوف زدہ کر کے بھگانا چاہتے ہوں۔ مگر بلّی اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں۔

چڑیوں کا انقلابی روپ اب بھی جاری تھا۔ وہ برابر نعرے بلند کر کے آسمان کو سر پر اٹھائے ہوئے تھیں۔ جبکہ بلّی کروٹیں بدل بدل کر اسی شاخ پر بے چین بیٹھی تھی۔

بچے اس بات پر غور وفکر کر ہی رہے تھے کہ بلّی کو وہاں سے کیسے بھگایا جائے اور چڑیوں کو کیسے شانت کیا جائے۔ تب ہی پرنس کی نگاہ پیڑ کے نیچے زمین پر گئی۔ سارا ماجرا اس کی سمجھ میں آ گیا۔ پیڑ کے نیچے کتّے منڈلا رہے تھے اور وقفے وقفے سے اپنا چہرہ اوپر اٹھا کر امید بھری نگاہوں سے بلّی کی طرف دیکھ رہے تھے، جیسے سوچ رہے ہوں۔

''کب تک چھپوگی پتّوں کی آڑ میں، کبھی نہ کبھی تو آوَ گی ہماری داڑ میں''

تینوں بچوں نے فوراً ایک ایمرجنسی میٹنگ کی، جس میں قرارداد پاس ہوئی کہ کتوں کو بھگایا جائے تو بلّی اپنے آپ پیڑ سے اتر آئے گی۔ پھر کیا تھا جنگی پیمانے پر بڑی بڑی اینٹوں اور لکڑی کے چھوٹے بڑے ٹکرے تلاش کیے گئے۔ ان اینٹوں، لکڑی کے ٹکروں کو کسی میزائل کی طرح کتّوں پر داغا گیا۔ مگر کتے پھرتی سے دائیں بائیں ہو کر بچتے رہے۔ آخر کار تمام میزائل ختم ہو گئے۔

ناکامی اور مایوسی کے اس عالم میں اچانک بچوں کو خیال آیا۔ ممکن ہے کتے بھوکے ہوں۔ آپس میں مشورہ کر کے روٹی کے ٹکرے لائے گئے۔ وہ ٹکرے کتّوں کے آگے پھینکے گئے۔ کتّوں نے بے دلی سے ٹکڑوں کو سونگھا اور ذرا فاصلہ بنا کر ٹہلنے لگے۔ چند لمحوں بعد انھوں نے پھر اپنی تھوتھنی اٹھا کر حسرت بھری نگاہوں سے بلّی کو دیکھا۔

پرنس نے کتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے آج یہ دونوں دوست بھی دعوت کے موڈ میں ہیں اور نان وتیج کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

''تو اب کیا کریں؟۔ ان دبنگوں کے لیے گوشت کہاں سے لائیں؟''

شانی کی اس بات پر پرنس نے کہا۔ ’’فکر مت کرو یار۔ رات پاپا نے اپنے آفس کے کچھ دوستوں کو نان ویج کی دعوت کے لیے انوائٹ کیا تھا۔ اب بھی کافی چکن باقی ہے۔ میں لے کر آتا ہوں۔

یہ کہتے ہوئے پرنس اپنے گھر کی طرف دوڑ پڑا۔

پرنس ایک پلیٹ میں بہت سے چکن کے پیس لے آیا تھا۔

تینوں نے گوشت کے ٹکڑے کتّوں کے آگے پھینکے، جسے وہ دم ہلاتے ہوئے بڑے چاؤ سے کھانے لگے۔ کچھ دیر دونوں کتّوں نے مزے کی دعوت اڑائی۔ زبان سے منہ پوچھا۔ بچوں کی طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھا اور وہیں ٹہلنے لگے۔

پرنس نے ایک اینٹ اٹھا کر ان کی طرف اچھالی۔ ’’جاؤ اب دعوت ختم!‘‘

ایک کتّے نے دوسرے کتّے کی طرف دیکھ کر ہلکے سے بھونکا! جیسے اپنے دوست سے کہہ رہا ہو۔ ’’اب چل نا یار! اپنی تو دعوت ہوگئی نا۔

دونوں کتّے وہاں سے کھسک لیے۔

چند منٹ بعد بلّی پیڑ سے نیچے اتری اور باقی بچے چکن کے ایک ٹکڑے کو منھ میں دبا کر ایک طرف کو دوڑ گئی۔ چڑیوں نے چلانا بند کر دیا۔ وہ دانہ چگنے کے لیے کھڑکی کی طرف اڑیں۔ کچھ چڑیاں لنچ کرتی رہیں اور کچھ چڑیوں نے اپنی چونچ میں دانے بھرے اور اپنے ننّھے منّے بھوکے بچوں کے لیے اپنے گھونسلے کی طرف چل پڑیں۔ اور پھر اچانک تینوں بچوں کو شدّت سے بھوک کا احساس ہوا۔ اور وہ تینوں اپنے اپنے گھر کی طرف لنچ کے لیے دوڑ پڑے۔

Zakir Husain
Room No. 146-E
Brahamaputra Hostel
JNU, New Delhi - 110067

ہفتے کے دن

ہفتے کے دن کل ہیں سات
گرمی ،سردی یابرسات
پہلا دن کہلائے پیر
محنت سے چمکے تقدیر
دو سرا دن یعنی منگل
جھوم کے ناچ اٹھا جنگل
تیسرے دن کا نام ہے بدھ
لے لو کچھ اپنی بھی سدھ
چوتھا دن ہے جمعرات
نکلی کوؤں کی بارات
پانچوں دن ہے خاص جمعہ
مومن کو ہے عید نما
اس کے بعد سنیچر آئے
گھر سے پڑھانے ٹیچر آئے
ساتواں دن ہے اپنا اتوار
پکنک مستی موج بہار

Zia Alam
H. No.: 10/10/27/2
Indira Gandhi Puram
P.O.: SanathNagar
Hyderabad - 500018

کے پی سکینہ

جب چوہے پر مقدمہ چلا!

یہ عجیب وغریب کہانی انسانی تہذیب کے اس دور کی ہے جب انسان جانوروں پر بھی مقدمہ چلایا کرتا تھا! تمھیں تعجّب ہو رہا ہے نہ! مگر یہ حقیقت ہے کے تاریخ کے ایک دور میں جانوروں کے لیے الگ عدالت ہوا کرتی تھی جہاں ان سے سرزد ہونے والے جُرم کے بنا پر ان پر مقدمہ چلائے جاتے تھے۔ اُن مقدموں کی پیروی انسانی وکیل کیا کرتے تھے۔ اب دیکھو اس کہانی کے کچھ حیرت انگیز ٹکڑے!

1846 - برگنڈی (فرانس) کھلے میدان میں رنگ برنگے کوٹوں میں ملبوس جج مُلزم کا انتظار کر رہے ہیں۔ سلاخوں میں بند مُلزم - ایک خونخوار بھیڑیا - پیش کیا جاتا ہے۔ اس پر قصبے کی دو بچّیوں کا خون کرنے کا الزام ہے۔ سرکاری وکیل دوسرے وکیل سے بحث کر رہا ہے۔ ہزار ہا تماش بینوں کی بھیڑ فیصلے کا انتظار کر رہی ہے۔ ججوں نے فیصلہ دیا کہ مُلزم بھیڑیئے کو سرِ راہ موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ چنانچہ زنجیروں جکڑے ہوئے بھیڑیے کا سر قلم کر دیا گیا۔

1586 کے مارچ کی 9 تاریخ - فلاسی کا نارمن ٹاؤن ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہے۔ مُقدمہ ایک بھینسے پر چل رہا ہے۔ زوردار بحث کے بعد خوں خوار بھینسے کو سزائے موت دی گئی۔ قتل کرنے سے پہلے اُسے خوش نما جھول پہنائی گئی اور بہترین چارہ دیا گیا۔ اسے یہ سزا ایک شِیر خوار بچّے کو اپنے سینگوں سے ہلاک کرنے کے جُرم میں دی گئی تھی۔

فرانس کے سیوانی قصبے میں ستمبر 1617 کا ایک دِن شام کے دھندلکے میں ایک سُورنی 6 بچّوں سمیت دھر لی گئی۔ ابھی وہ اپنے شکار (ایک 6 سالہ بچّی) کو ختم بھی نہ کر پائی تھی کہ قانون کے گرفت میں آ گئی۔ وکیل صفائی جس کی فیس سورنی کے مالک نے ادا کی تھی، زوردار بحث کے باوجود مُلزم کو نہ بچا سکا۔ سورنی کے بچّے اس بنا پر رہا کر دیے گئے کہ ابھی وہ نابالغ ہیں۔ مگر قسمت کی خوبی دیکھیے کہ دو سال بعد اُسی سُورنی کے دو بچّے خود قتل کے جرم میں عدالت میں پیش کیے گئے اور

پہلے والے وکیل صفائی کا لائسنس ضبط کرلیا گیا۔

5 ستمبر 1470 کو فرانس ہی میں ایک قصبے میں ایک تیندوے پر ایک کسان کو زخمی کرنے کا الزام لگا۔ تیندوے کو عدالت میں حاضر کیا گیا۔ چشم دید گواہ نہ ملنے پر عدالت نے تیندوے کو باعزّت بَری کر دیا۔ مگر عدالت سے باہر نکلتے ہی تیندوے نے ایک شخص کو زخمی کر دیا اور اسے دوبارہ عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس مرتبہ اُسے سزا دی گئی اور اُس کی ایک ٹانگ عدالت میں ہی کاٹ لی گئی۔

1639 میں ڈی جان قصبے کی ایک گھوڑی اور 1647 میں اسی قصبے کے ایک گھوڑے کو عدالت کے فیصلے کے مطابق زندہ جلا دیا گیا۔ ان پر اپنے اپنے سائیسوں کو ہلاک کرنے کا الزام تھا۔

مشہور انگریز مؤرخ سر جان کلیولینڈ نے لکھا ہے کہ سولھویں اور سترھویں صدی میں فرانس اور دوسرے یورپین ملکوں میں کیڑے مکوڑے، چوہوں اور دوسرے پرندوں پر باقاعدہ مقدمے چلتے تھے اور اُن کی پیروی قانون کے مطابق انسانی وکیل کیا کرتے تھے۔

کلیولینڈ نے ہی لکھا ہے کہ 1521 میں بارتھولیو چینی نام کے ایک نوجوان فرانسیسی وکیل نے چوہوں کے سرکاری وکیل، کا عہدہ حاصل کرکے بے شمار دولت کمائی۔ اس کا کام سرکار کی جانب سے اُن چوہوں سے مقدمہ لڑنا تھا جو فصل کو برباد کرنے پر تُلے تھے۔ ایک مرتبہ جب پیشی کے دن ملزم چوہے کو حاضر نہیں کیا جاسکا تو چوہے کے وکیل کو (جس کے اخراجات سرکار برداشت کرتی تھی) جُرمانہ ادا کرنا پڑا اور لکھ کر یہ قرار بھی کرنا پڑا کہ چوہے کو اگلی پیشی پر حاضر کیا جائے گا۔

امریکہ کے رسالے نیچر کے ایک شمارے میں ڈاکٹر اے الیکیندر شان نے اسی طرح کے کچھ اور دل چسپ مقدموں کے بارے میں لکھا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ جانوروں کی عدالت میں پیش ہونے والے ملزم کتّوں کی سزا ان کے مالک کو بھگتنی پڑتی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی قانون تھا کہ ملزم کتّے کے جسم کے اُسی حصّے سے گوشت کاٹا جائے جہاں اُس نے انسان کو کاٹا تھا۔ کتّے کے پاگل ثابت ہونے پر اسے باعزّت بَری کر دیا جاتا تھا۔

پرندوں پر مقدمے عام طور پر چیل، گِدھ اور طوطوں پر چلا کرتے تھے۔ تمھیں یہ جان کر اور حیرت ہوگی کہ اس زمانے میں چرندوں، پرندوں کو عدالت میں گواہی دینے کی بھی اجازت تھی 1499 فرانس کے آتون قصبے میں ایک پاگل کتّے کو عدالت میں اس بنا پر بری کرنے کی جگہ سزائے موت دی گئی تھی کہ گواہ طوطے نے اُس کی پول کھول دی تھی اور عدالت کے یہ پوچھنے پر کہ کتّا پاگل ہے یا نہیں، طوطے نے 'نہیں' یعنی نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ ڈاکٹر سر جان کلیولینڈ نے لکھا ہے کہ موت کی سزا پانے والے سانپوں کو پٹاری میں بند کرکے دہکتی آگ پر رکھ دیا جاتا تھا۔

آج تک یورپ کی ان عجیب غریب عدالتوں کا کوئی خاص سبب یا مقصد نہیں دریافت کیا جاسکا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اگلے وقتوں کے لوگ سچ مچ اتنے انصاف پسند ہوں کہ انصاف کی جہانگیری ترازو پر انسان اور جانور کو برابر تولتے ہوں۔ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جانوروں کی عدالت کی آڑ لے کر صرف امیر لوگ اپنی دل بستگی کا سامان کر لیتے ہوں۔ اب تو ایسی عدالتوں کے واقعات خالی قصّہ کہانی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر تاریخ اُس دَور کی گواہ ہے جب انصاف جانوروں کو بھی نہیں بخشتا تھا۔

(مصنف کے پی سکسینہ ہندی زبان کے مشہور ادیب اور مزاح نگار بھی تھے)

راجہ مہدی علی خاں

خرگوشوں کی غزل

کوئی شکاری بار بار بن میں ہمارے آئے کیوں؟
چونکیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ڈرائے کیوں؟
گھر نہیں، جھونپڑی نہیں کٹیا نہیں مکاں نہیں؟
بیٹھے ہیں جنگلوں میں ہم کوئی ہمیں بھگائے کیوں؟
کان کھڑے نہ کیا کریں گھاس میں کیوں نہ ہم چھپیں
کھٹکا ذرا بھی ہو اگر کوئی ٹھٹک نہ جائے کیوں؟
بن میں ہمارے جو بھی آئے سیر مزے سے وہ کرے
آئے ہزار بار خود کتوں کو ساتھ لائے کیوں؟
امی سے مار کھا کے بھی خوش کوئی کس طرح رہے
پانی مزے سے کیوں پیئے گھاس مزے سے کھائے کیوں؟
کہتا تھا اک شکاری یہ ''آئیں گے ہم ضرور یاں
جس کو ہے اپنی جاں عزیز بن میں وہ گھر بنائے کیوں؟
چڑیاں نہ چہچہائیں کل سوئیں گے ہم دوپہر تک
بند ہے بن کا مدرسہ کوئی ہمیں جگائے کیوں؟

راجہ مہدی علی خاں بڑے مزے کے شاعر تھے۔ انھوں نے مزاحیہ شاعری بڑوں کے لیے بھی کی اور بچّوں کے لیے بھی۔ مگر ان کی سبھی مزاحیہ غزلوں اور نظموں میں، ایک طرح کا 'بچپنا' چھایا رہتا تھا۔ یہاں آپ خرگوشوں کی جو 'غزل' پڑھ رہے ہیں وہ دراصل مرزا غالب کی ایک غزل کی پیروڈی ہے۔ جب کسی سنجیدہ تحریک یا شعر کے لفظ بدل کر مذاق کیا جاتا ہے یا اسے مزاحیہ شکل دی جاتی ہے تو اسے پیروڈی (Parody) کہتے ہیں۔ راجہ صاحب کی کہی ہوئی یہ غزل مرزا غالب کی جس غزل کی پیروڈی ہے اس کا مطلع ہے

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

مترجم: انیس الدین ملک

سائنس کی الف لیلہ

کہانی نیلے رنگ کی

اس کتاب کے کسی اگلے باب میں رنگوں کا بیان ہے۔لیکن صرف ان رنگوں کا جو سینکڑوں سال پہلے بہت عزت سے دیکھے جاتے تھے اور ان کا استعمال شاہی خاندان اور دولت مندوں میں ہوتا تھا۔آج کل بہت سارے رنگ استعمال میں ہیں۔ یہ نہ صرف چمک دمک میں ان پرانے رنگوں جیسے ہیں بلکہ انھیں آب وتاب میں مات کردیا ہے۔اس کے علاوہ ان کی قیمتیں بھی ایسی ہیں جنھیں اکثر لوگ خرید سکتے ہیں۔ ان میں سے کچھ رنگ اتفاق سے دریافت ہوئے۔ اس سلسلے میں دو کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔

1710 میں ایک دن رنگ بنانے والا ڈسبیک اپنی تجربہ گاہ میں ایک تجربے کے دوران پھٹکری، لوہے کے نمک کا محلول اور کوچنیل (جو ایک سرخ رنگ ہوتا ہے) استعمال کررہا تھا۔ان تجربات کے دوران اسے ایک محلول کی ضرورت پڑی جسے کھار کہتے ہیں۔اس نے اس محلول کی بوتل ایک دوسرے کیمیا داں سے مانگی جو اسی تجربہ گاہ میں کام کررہا تھا۔اس نے کھار کو ایک برتن میں ڈالا جس میں دوسری شے موجود تھی۔اسے امید تھی کہ اسے لال رنگ کا رسوب ملے گا جیسا کہ پہلے تجربے میں ملا تھا۔لیکن جب اسے نیلا رنگ ملا تو وہ حیران رہ گیا۔

اس نے رنگ میں اس عجیب وغریب تبدیلی کے بارے میں دوسرے کیمیاں داں سے مشورہ کیا۔اسے یاد آیا کہ یہ کھار تازہ نہیں تھا بلکہ وہ کھار تھا جو اس نے ایک دوسرے تجربے میں استعمال کیا تھا۔اس دوسرے تجربے میں کھار میں ایک حیوانی مادہ شاید بیل کا خون استعمال کیا گیا تھا اور اس کے بعد اسے بوتل میں واپس لوٹا دیا گیا تھا۔اس لیے اس بات کا قوی امکان تھا کہ شاید کھار میں آمیزش (ملاوٹ) ہوگئی ہو۔ درحقیقت دوسرے کیمیا داں کو پہلے کیمیاں داں کو بغیر یہ بتائے ہوئے کہ کھار میں ملاوٹ ہے، بوتل نہیں دینا چاہیے تھا۔خوش قسمتی سے

یہ لاپروائی کا قدم دونوں کیمیادانوں کے لیے ایک سراغ کا باعث بنا جسے انھوں نے تحقیقات کے لیے موزوں سمجھا۔ اس لیے انھوں نے جان بوجھ کر اس اتفاقی واقعے کو دہرایا۔ انھوں نے بیل کا خون خالص کھار میں ڈالا اور اسی کو چینل پھٹکری اور لوہے کے نمک کے مکسچر میں ڈالا۔ اس دفعہ بھی ایک نیلی شے حاصل ہوئی۔ جلد ہی انھیں یہ معلوم ہوا کہ یہ ایک بہت ہی اچھا رنگ ہے۔ جس ملک میں اس رنگ کی دریافت ہوئی تھی اس ملک کی عزت افزائی کی غرض سے اس رنگ کا نام پروشین بلیو رکھا گیا۔

کئی سال تک اس کے بنانے کا طریقہ خفیہ رکھا گیا اور یہ شے زیادہ قیمت پر بیچی گئی۔ لیکن 1724ء میں اس کے بنانے کا طریقہ ایک دوسرے کیمیاداں نے شائع کردیا اور کچھ ہی عرصے میں یہ رنگ بہت سے ملکوں میں کافی مقدار میں بننے لگا۔

اس سے پہلے کہ دوسری کہانی شروع ہو اس بات کی تشریح کرنا ضروری ہوگا کہ انیسویں صدی تک کیمیائی اشیا (Chemicals) کو دو گروپوں میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ نامیاتی اشیا اور غیر نامیاتی اشیا۔ نامیاتی اشیا وہ اشیا تھیں جو زندگی سے تعلق رکھتی تھیں۔ جیسے شکر اور نشاستہ۔ اور یقین کیا جاتا تھا کہ یہ قدرتی طور پر نباتاتی یا حیوانی اجسام میں ملتے ہیں۔ دوسری طرف غیر نامیاتی اشیا، زمین، ہوا یا پانی میں ملتی تھیں جیسے کھانے کا نمک، دھاتیں، آکسیجن، مٹی چونے کا پتھر وغیرہ اور ان میں وہ سب چیزیں شامل تھیں جنھیں کیمیاداں تجربہ گاہ میں بنا سکتے تھے۔

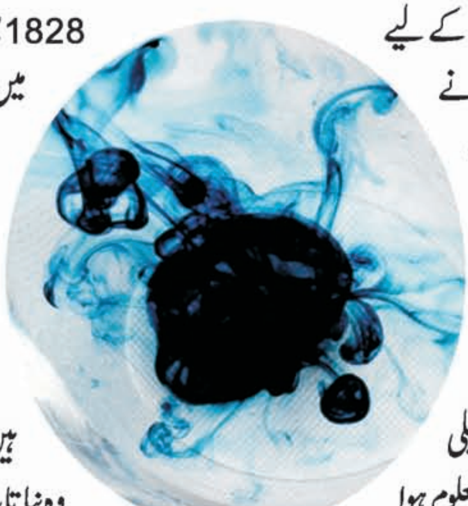

1828 میں ایک جرمن کیمیاداں نے تجربہ گاہ میں یوریا بنانے کا طریقہ دریافت کیا۔ یہ شے اس سے پہلے صرف حیوانی جسم میں بنتی تھی۔ یہ ایک بہت ہی اہم دریافت تھی۔ کیمیاداں جلد ہی اس بات سے واقف ہو گئے کہ وہ تجربہ گاہ میں بہت سی ایسی چیزیں بنا سکتے ہیں جن کے بارے میں یہ خیال تھا کہ وہ نباتات اور حیوانات میں ملتی ہیں۔

کچھ ہی سال میں بہت ساری نامیاتی چیزیں تجربہ گاہ میں تیار کی گئیں۔ جرمن کیمیادانوں نے علم کیمیا کے اس پہلو پر خصوصی توجہ کی۔ ان میں سب سے ممتاز اگست ولہیلم ہاف مین تھا جس نے تارکول کا خاص مطالعہ کیا۔ طالب علمی کے دوران اس نے ثابت کیا تھا کہ تارکول میں سے نکلنے والی ایک شے وہی تھی جو نیل کے پودے سے نکالی گئی تھی (نیل سے اس زمانے میں بڑی مقدار میں نیلا رنگ نکالا جاتا تھا جس کی صنعت کو ضرورت تھی) اس شے کا نام انیلین دیا جو عربی کے دو لفظوں ان، نیل سے بنا ہے جس کے معنی نیلی شے کے ہیں۔

1845 میں اسے لندن میں رائل کالج آف کیمسٹری کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ وہاں اس نے قدرتی چیزوں کو تجربہ گاہ میں بنانے کے تجربات کا سلسلہ جاری رکھا۔ چار سال کے بعد اس نے کونین کے بنانے کا ارادہ کیا لیکن اس سلسلے میں اس نے کوئی عملی قدم کبھی نہیں اٹھایا۔

کونین اس زمانے کی بہت مشہور دوا تھی۔ ڈاکٹر اسے بیسویں صدی میں بیشتر حالتوں میں تجویز کرتے رہے۔ 1849 میں اسے سنکونا درخت سے نکالا گیا۔

تقریباً تین سال بعد ہاف مین نے ولیم ہنری پارکن کو اپنی تجربہ گاہ میں اسسٹنٹ مقرر کیا۔ یہ ایک پندرہ سال کا نوجوان تھا۔ پارکن کو اسکول میں علم کیمیا سے بڑی گہری دلچسپی تھی۔ اس کے والدین نے اس مطالعے میں اس کی حوصلہ افزائی کی اور اسے گھر میں تجربہ گاہ بنانے کی اجازت دے دی۔ رائل کالج سے واپس آنے کے بعد وہ اپنی زیادہ تر شامیں تجربہ گاہ میں گزارا کرتا تھا۔ پارکن کی تجربہ گاہ میں بہت کم سامان تھا جیسا کہ اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔

''میری اپنی ذاتی تجربہ گاہ چوڑائی میں بہت چھوٹی لیکن لمبی تھی جس میں بوتلیں رکھنے کے لیے چند الماریاں تھیں اور ایک میز تھی۔ آتش دان میں ایک بھٹی بنائی گئی تھی۔ پانی یا گیس کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ میں پرانے اسپرٹ لیمپ سے کام کیا کرتا تھا اور سائبان میں کوئلہ جلایا کرتا تھا اور اس تجربہ گاہ میں شام اور چھٹیوں میں کام کیا کرتا تھا۔''

تعجب کی بات نہیں کہ پارکن اپنے استاد کی تحقیقات کے موضوع یعنی قدرتی طور سے ملنے والی اشیا کو تجربہ گاہ میں بنانے میں دلچسپی رکھتا تھا اور اس نے 1856 کی ایسٹر کی چھٹیوں میں کونین بنانے کا فیصلہ کیا۔ کچھ مصنفین کی رائے میں ہاف مین نے اس سلسلے میں پارکن کی ہمت افزائی کی۔ لیکن کئی سال بعد پارکن نے کہا کہ ایک دوا کی حیثیت سے کونین کی اہمیت نے اسے کافی متاثر کیا۔ لیکن اس بات کا بھی امکان ہے کہ پارکن کا دھیان ان کی طرف گیا ہو جو سات سال پہلے ہاف مین نے کونین کی تجربہ گاہ میں تیاری کے سلسلے میں لگائے تھے۔

پارکن نے پریکٹیکل کرنے سے پہلے اپنے تجربات کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا۔ اس نے سوچا کہ ہاف مین نے ایک شے جو تارکول سے نکالی ہے وہ کونین کی کیمیاوی بناوٹ سے ملتی جلتی ہے۔ اس لیے اس نے اسی شے سے تجربہ شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے اور دوسری چیزوں کے بارے میں سوچا جن کی اسے کونین میں تبدیل کرنے میں ضرورت پڑے گی اور پھر وہ کام میں لگ گیا۔ لیکن اس کے شروع کے تجربے ناکامیاب رہے۔

پارکن نے پھر ایک دوسری شے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا جو ہاف مین نے طالب علمی کے زمانے میں تارکول سے نکالی تھی۔ اس نے اس شے کو جس کا نام انیلین تھا، ایک جانچ کی نلی میں لیا اور پہلے سے غور وخوض کی ہوئی دوسری اشیا کے ساتھ ملایا۔ اس دفعہ اسے ایک سیاہ رسوب نلی کے پیندے میں ملا۔ اس کا معائنہ کرنے پر اسے پتہ چلا کہ اس رسوب کا بیشتر حصہ الکحل میں گھل جاتا ہے لیکن بجائے ایک بلا رنگ کے کونین کے محلول کے جس کی اسے امید تھی، اسے ایک

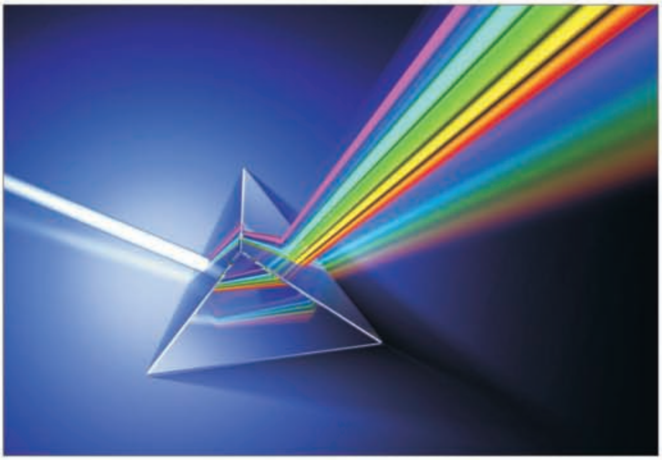

خوبصورت بنفشئی رقیق ملا۔

جلد ہی اس نے پتہ لگایا کہ اس رقیق رنگ کی کئی خصوصیات ہیں اور تیز سورج کی روشنی میں یہ رنگ ہلکا نہیں پڑتا۔ اس نے یہ رنگ اپنے ایک دوست کو دکھلایا جو ایک آرٹسٹ تھا اور رنگین اشیا میں بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ رنگ بیش قیمت ثابت ہوسکتا تھا۔

پارکن اپنے ایک دوسرے دوست کے ذریعہ برطانیہ کے رنگوں کے سب سے مشہور کارخانے پرتھ کے پلرس متعارف ہوا۔ اس نے اس کو ریشم کے رنگے ہوئے کچھ نمونے بھیجے اور اسے مندرجہ ذیل جواب ملا۔

''اگر آپ کی اس دریافت (یعنی رنگ) سے مال کی قیمت بہت زیادہ نہیں ہوتی تو یہ یقیناً بہت عرصے کے بعد ایک گراں قدر دریافت ہوگی۔ یہ رنگ ایسا ہے جس کی تمام قسم کے مال میں مانگ ہے۔ اس سے پہلے ایسا کوئی رنگ نہیں جو ریشم پر گہرا چڑھ سکے۔ اور سوتی کپڑوں پر ایسا رنگ چڑھانے میں کافی لاگت آتی ہے۔ میں ارغوانی رنگ میں چھپا ہوا سوتی کپڑے کا نمونہ بھیج رہا ہوں۔ یہ صرف برطانیہ کی ایک کمپنی میں رنگا جاتا ہے اور پھر بھی وہ ساری خصوصیات نہیں رکھتا جو آپ کے رنگ میں ہیں۔ یہ نہ ہی زیادہ تیز ہے اور دوسری طرف ہوا میں رکھنے پر ہلکا پڑ جاتا ہے۔

پلرس جیسی ممتاز کمپنی سے اپنے تعریفی خط کے ملنے پر ایک اسکول میں جانے والی عمر کے نوجوان کی خوشیوں کا کیا کہنا۔ پارکن نے اپنے بھائی اور باپ کو اس سلسلے میں مدد کرنے کے لیے راضی کرلیا، اور چند ہی ماہ بعد ایک کارخانہ تعمیر ہوا جس سے تارکول سے پہلی بار رنگ بنائے گئے۔

اس نئے رنگ کو فوراً ہی کافی مقبولیت ملی کیونکہ طیف (Spectrum) کے تمام رنگوں میں پارکن کو یہ اتفاقاً ایسا رنگ (یعنی بنفشی) ملا جو اس زمانے کے لوگوں کو سب سے زیادہ عزیز تھا اور اس لیے اس رنگ کی بہت مانگ تھی۔ یہ ایک ایسا رنگ ہے جس کی سیکڑوں سال سے اور رنگوں کی بہ نسبت زیادہ قدر تھی۔ شہنشاہ نیرو کے زمانے سے بھی پہلی ٹائرن بنفشی صرف شاہی خاندان اور بہت ہی معزز لوگوں کے استعمال میں تھا اور یہ اتفاقی مطابقت ہوئی کہ جس زمانے میں پارکن نے یہ رنگ دریافت کیا، اسی زمانے میں فرانس میں شہزادی یوجن نے ایک فیشن رائج کیا جس میں بنفشی پوشاکیں پہنی جاتی تھیں جسے فرانسیسی ماؤے کہتے تھے۔ اسے انگلستان کی خواتین نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ اپنایا۔

پارکن نے بھی اپنے نئے رنگ کا نام ماؤے رکھا۔ اس لفظ نے جلد ہی زبردست مقبولیت حاصل کی۔ اس کا ذکر وکٹورین موسیقی ہال میں کیا گیا۔ مندرجہ ذیل بیان اس سلسلے میں کافی دلچسپ ہے کہ آیا اس لفظ کی مقبولیت کی وجہ فرانسیسی پوشاکوں کا رنگ تھا یا جیسا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں، یا پرکن کا دریافت کیا ہوا نیا رنگ تھا۔

''جو لوگ اس زمانے میں زندہ تھے صرف انھیں اس حقیقت کا علم تھا کہ کس طرح اس رنگ کو اور اس بات کو کہ یہ رنگ تارکول سے نکالا گیا مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ ہر جگہ گفتگو کا موضوع تھا اور اتنا زیادہ عام تھا کہ اس وقت کے ایک خاص سوانگ میں ایک کردار یہ شکایت کرتا ہے کہ ہر شخص سوائے ماؤے کے کوئی اور گفتگو نہیں کرتا۔'' اور آگے کہتا ہے ''حتیٰ کہ پولیس کا سپاہی بھی کہے گا کہ تم وہاں چلو۔''

چند ہی سال کے عرصے میں بہت اور نئے رنگ دریافت ہوئے جنھوں نے سیکڑوں سال سے استعمال میں آنے والے قدرتی رنگوں کی جگہ لے لی۔ ان نئے مصنوعی رنگوں کو قدرتی رنگوں کے مقابلے میں زیادہ آسانی اور کم خرچ میں تیار کیا جاسکتا ہے اور یہ بہت ساری قسموں میں مل سکتے تھے۔ ان دریافتوں کی بنا پر پروفیسر ہاف مین نے پارکن کی دریافت کے چھ سال کے بعد مندرجہ ذیل پیشن گوئی کی۔

''وہ دن دور نہیں جب انگلستان بلاشبہ دنیا کا سب سے بڑا رنگ بنانے والا ملک بن جائے گا۔ سب سے بڑا انقلابی عجوبہ یہ ہوگا کہ وہ کوئلہ سے نکالا ہوا نیلا رنگ نیل پیدا کرنے والے ہندوستان میں بھیجے گا۔ اس کے علاوہ اپنے یہاں کشید کیا ہوا قرمزی کوچینل پیدا کرنے والے میکسیکو کو اور اپنی معدنی اشیا کیوریسٹرون اور سیفلوور کی جگہ پر چین، جاپان اور دوسرے ممالک کو جہاں سے یہ اشیا آتی ہیں بھیجا جائے گا۔''

(کیوریسٹرون ایک چھال ہے اور سیفلوور ایک طرح کا پھول ہے جنھیں 1860 تک ان کو رنگ بنانے کے کام میں استعمال کیا جاتا ہے۔)

بدقسمتی سے برطانوی کارخانہ رکھنے والے کیمیادانوں نے جرمنوں کی طرح موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ لہٰذا پہلی جنگ عظیم کے شروع میں انگلستان کے مقابلے میں جرمنوں کی رنگوں کی صنعت کہیں اچھے مقام پر تھی۔ لیکن جنگ کے نتیجے میں عظیم برطانیہ اور دوسرے ملکوں کو اس بات کا سبق ملا کہ ایک مضبوط کیمیاوی صنعت کے ہونے پر لڑنے والی قوموں کو بے شمار فائدے رہتے ہیں۔ آج کل تارکول سے مصنوعی رنگ بنانے کی صنعت دنیا کی بڑی صنعتوں میں ہے۔

ہاف مین کی یہ پیشن گوئی کہ کوئلے سے نکالے ہوئے نیلے رنگ نیل پیدا کرنے والے ہندوستان کو جلد ہی بھیج دیے جائیں گے جلد ہی سچ ثابت ہوئی۔ جلد ہی مصنوعی نیل کو اتنے بڑے پیمانے پر اور اتنا سستا تیار کیا جانے لگا کہ نیل کی درآمد تقریباً بند ہوگئی اور ہزاروں ہندوستانی جو نیل کی صنعت میں کام کرتے تھے، بیکار ہوگئے۔

ماؤے کی دریافت کے فوراً بعد ایک اور مصنوعی رنگ النربرین منظر عام پر آیا جو تارکول سے بنایا گیا تھا اور اس نے برسوں سے استعمال میں آنے والے ایک قدرتی رنگ کی جگہ لے لی۔ یہ قدرتی سرخ رنگ مادر پودے کی جڑوں سے نکالے جاتے تھے۔ اس پودے کی کاشت فرانسیسی اور دوسرے ملکوں کے کسانوں کے لیے ایک منافع بخش پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ اس رنگ کے استعمال کے ختم ہونے سے ان لوگوں کو ایک مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک 18 سال کے نوجوان کی السٹرا کی چھٹیوں میں اپنی تجربہ گاہ میں کی گئی دریافت نے کیمیاوی صنعت اور زراعت میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ ایک انقلاب تھا جو شاید زیادہ دیر نہیں آتا حتیٰ کہ 1856 میں پارکن نے خوش قسمتی سے یہ دریافت نہ کی ہوتی۔

(قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب سائنس کی کہانیاں سے ماخوذ)

مضمون
ڈاکٹر بانو سرتاج

چھوٹی سی گڑیا کی لمبی کہانی

بچے نے جب کھیلنا سیکھا ہوگا۔ تو ماں نے کوئی کھلونا اس کے ہاتھ میں دیا ہوگا۔ خالی ڈبے میں کنکر ڈال کر بجنے والا باجا۔ روٹی پکاتے پکاتے آٹے کے لوندے ہاتھ منہ بنا کر کوئی گڑیا، لکڑی کا عمدہ ٹکڑا جو گڑیے جیسا لگتا ہو وغیرہ یہی کھلونوں کی ابتدائی شکل تھی اور ان کے ساتھ ہی گڑیا کا بھی آغاز ہوا ہوگا۔

ایک وقت تھا جب ننھی بچیوں اور گڑیوں کا بہت نزدیکی رشتہ تھا۔ تھوڑی سی سمجھ آتے ہی بچی گڑیا کی فرمائش کرتی تھی اور نانی دادی فوراً پرانے کپڑے قینچی اور سوئی دھاگا لے کر بیٹھ جاتی تھیں۔ آناً فاناً تیار ہو کر گڑیا بچی کی گود میں پہنچ جاتی تھی جس کی بچی ویسے ہی دیکھ بھال کرتی یہ جیسی اس کی اماں خود اس کی کرتی تھیں نہلانا، دھلانا کھلانا پلانا، سجانا، سنوارنا، لوری گا کر سلانا۔

اس زمانے میں کوئی خاتون ایسی نہ ہوتی جسے گڑیا بنانا نہ آتا ہو۔ کوئی بچی ایسی نہ ہوتی تھی جس کے پاس گھر کی بنی ہوئی گڑیا نہ ہو۔ جس نے اپنی گڑیا کے لیے سلائی، کڑھائی نہ سیکھی ہو، کھانا بنانا نہ سیکھا ہو دنیا داری نہ سیکھی ہو۔ غریب سے غریب لڑکی بھی ایک گڑیا کی مالکن ضرور ہوتی تھی۔

بچیاں گڑیوں سے صرف کھیلتی ہی نہیں تھیں ان کی شادیاں بھی کرتی تھیں۔ گڈے دولہا کی بارات جاتی اور دلہن گڑیا لے کر لوٹتی۔

بہن کو ستانا ہوتا تو بھائی گڑیا چھپا دیتے۔ وہ روتیں تو واپس کر دیتے گڑیوں کے بال کھینچتے، ان کے گھر توڑ دیتے اور پھر

یہی بھائی گڑے گڑیوں کی شادی میں جی جان سے کام کرتے جیسے خود ان کی بہن کی شادی ہو رہی ہو۔

آج بچیاں ہیں، بچپن ہے لیکن گڑیا کہیں غائب ہوگئی ہے۔ ان کی جگہ ماڈرن کھلونوں نے لے لی ہے۔ بچو! آج ہم سے سنو چھوٹی سی گڑیا کی چھوٹی سی کہانی۔

گڑیا کو انگریزی میں ڈول (Doll) مراٹھی میں گڑیا باہلی (Bahuli) راجستھانی زبان میں گنگاوتی کہتے ہیں۔ گپت کال میں گڑیا پترکا (Putrika) نام سے جانی جاتی ہے۔ کالی داس کے شاہکار کمار شمبھو (Kumar Shambho) میں ننھی پاروتی کو مصنوعی پترکا (Imitatioan Doll) سے کھیلتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ کتھا مرت ساگر میں اڑنے والی لکڑی کی گڑیا کا ذکر ملتا ہے۔

بچوں کے کھلونوں میں ایک اہم کھلونا ہے گڑیا۔ سستی اور آسانی سے دستیاب ہونے والی گڑیا نے قدیم زمانے سے آج تک مختلف رنگ وروپ بدلے ہیں۔ گڑیا کسی بھی ملک کی ہو، اپنی تہذیب کی عکاس ہوتی ہے۔

قدیم زمانے میں گھروں میں بنائی جانے والی گڑیا میں قدرتی جادوئی رنگ، مٹی کی خوشبو اور معصوم خواہشوں کا انمول خزانہ ہوتا تھا۔ آج کی گڑیا تجارتی نقطہ نظر سے بنائی جاتی ہے۔ پرانے زمانے میں پرانے کپڑوں، مٹی، لکڑی، آٹے، ٹین کے ٹکڑوں، کھوپڑے کے خول، کاغذ کی لگدی سیپی، دھات وغیرہ سے گڑیا ئیں بنتی تھیں، آج پلاسٹک، جوٹ، پلاسٹر آف پیرس، چینی مٹی اور کانچ سے گڑیا بنتی ہے۔ لکڑی کی گڑیا بھی اچھی بنتی ہے۔ آندھرا پردیش کے ایٹی کو پکا Etikopakka گاؤں کی لکڑی کی گڑیا بہت مشہور تھی۔ انسانی شکل وصورت کے علاوہ چرند پرند اور گھریلو استعمال کی چیزوں کو بھی گڑیا کے ساتھ دکھایا جاتا تھا۔ زمانہ حال میں کرناٹک پردیش کا چیناپٹنہ (Chenapatna) علاقے لکڑی کی گڑیاؤں کے لیے زیادہ مشہور ہے۔

ہندوستان کی تقریباً تمام ریاستوں میں گڑیا بنانے کا فن زندہ ہے۔ ہر ریاست اپنی تہذیب کی شناخت کرانے والی شبیہ بناتی ہے جو روایتی لباس اور زیورات سے سجائی جاتی ہے۔

ہر ایک علاقے کی عام طور پر شناخت ان کی گڑیوں سے ہوتی ہے۔ اسی لیے گڑیا کو ملک کا تہذیبی سفیر (Cultural Ambassador) بھی کہتے ہیں۔ وہ ملک کے مختلف حصوں میں ہی تہذیبی پرچم اٹھائے نہیں جاتیں۔ غیر ملکوں میں بھی ہندوستان کی شناخت کرواتی ہیں۔

بہار کی مٹی کی گڑیا اکثر رقص کے مختلف پوز میں ہوتی ہے۔ یہاں لڑکیوں کو شادی میں گڑیا دی جاتی ہے۔

لکھنو کی گڑیاں موسیقی کے آلات کے ساتھ ریاست کے

سازاور کلاکاروں کی پہچان کراتی ہیں۔

تامل ناڈو کے پن رُٹی)(Panrutti) علاقے میں بنائی جانے والی مٹی کی گڑیا دیہی علاقے کی نمائندگی کرتی ہے ان میں گھر گھر کا آنگن، آنگن میں بندھے جانوراور پنجروں میں قید پرندے، گھریلو استعمال کی چیزیں نظر آتی ہیں۔او خصوصاً چیٹی یار جوڑا(Chettiyar Couple) بہت ہی دلفریب ہوتا ہے۔

بنگال کے کرشنا نگر کی دیوی۔ دیوتا کی شبیہ والی اور عام انسانی گڑیا بے حد دلکش ہوتی ہیں۔

☆ آسام کی گڑیا اس علاقے کی گھریلو زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔خصوصا آدی واسی زندگی کی۔

بھارت میں مہاراشٹر کے ساونت واڑی اور ناسک ،اتر پردیش کے لکھنو، آگرہ، متھرا بہرام پور، مرشدآباد اور کرناٹک میں میسور گڑیوں کے لیے مشہور ہے۔

آج بھارت میں گڑیوں کو صرف علاقائی رنگ وروپ ہی نہیں دیا جاتا بلکہ ان کا رہن سہن بھی دکھایا جاتا ہے۔کھانا بناتی آنگن جھاڑتی بچوں کے ساتھ کھیلتی عورتیں تو گڑیا کے روپ میں بہت آچکیں۔اب وہ آفس جانے لگی ہیں، پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرنے لگی ہیں۔ ہوائی جہاز اڑانے لگی ہیں۔مختلف کھیلوں میں حصہ لینے لگی ہیں تو ظاہر ہے گڑیوں میں بھی اسکیٹنگ گرل، کراٹے گرل نظر آئیں گی۔

بھارت میں کچھ تہواروں پر گڑیا کو خاص اہمیت دی جاتی ہے جیسے...

☆ مہاراشٹر میں مہالکشمی اور منگلا گور تہواروں پر گڑیوں کی پوجا کی جاتی ہے۔

☆ مہاراشٹر ہی میں اکثر تہواروں پر گڑیا۔گڈے کی شاد

کی جاتی ہے۔

☆ اتر پردیش میں ناگ پنچمی کے تہوار پر گڑیوں کو ندی میں جل سمادھی دی جاتی ہے۔اس موقع پر وہاں گڑیوں کا میلا لگتا ہے۔

☆ کانگڑہ، ہماچل پردیش میں رتّو (Rattu) تہوار پر گڑیوں کو سجایا جاتا ہے۔

☆ گجرات میں گوروا (Gaurva) تہوار پر لڑکیاں برت(fast) رکھتی ہیں۔گڑیوں کو سجاتی ہیں۔

دشہرہ کے تہوار پر تامل ناڈو، کرناٹک، مہاراشٹر اور آندھراپردیش وغیرہ میں گڑیوں کی بہار ہوتی ہے مگر کولو تامل

ناڈو کی بات ہی کچھ اور ہے۔

کولو میں گڑیائیں ویسے ہی نظر آتی ہیں جیسے دیوالی میں دیے جلتے ہیں۔ چراغاں ہوتا ہے۔ نوراتری کے نو دنوں میں ہر گھر میں گڑیوں کی نمائش ہوتی ہے صندوقوں میں رکھی گڑیائیں نکال کر سجا سنوار کر ٹیبل پر اور سیڑھیوں کی طرح بنائے گئے ریک پر رکھی جاتی ہیں۔ ان کی پوجا کی جاتی ہے۔ جیسے شمالی علاقوں کی رام لیلا مشرقی علاقے کا درگا اُتسو ویسے ہی جنوبی علاقوں کا دشہرہ مشہور ہے اور اس میں بھی گڑیوں کا میلا زیادہ اہم ہے۔

غیر ملکوں میں جاپان میں ہنامات (Hinamat) نامی گڑیوں کی شادی کا تہوار منایا جاتا ہے۔ مکان کے سب سے بڑے اور ہوادار کمرے میں سیڑھیوں والے ایک ریک پر گڑیوں کو سجایا جاتا ہے۔ سب سے اوپر راجہ رانی گڑیوں کو رکھا جاتا ہے۔ لڑکیاں مقامی لباس کھونو بہن کر پوجا کرتی ہیں۔ گھر کے بڑے لوگ لڑکیوں کو گڑیا کا تحفہ دے کر اچھا اور نیک بننے کی دعائیں دیتے ہیں۔

تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو قدیم زمانے سے گڑیا کے وجود کی شہادت دستیاب ہوتی ہے کھدائی میں مختلف جگہوں پر گڑیائیں حاصل ہوئی ہیں۔

امریکہ کی گڑیا بنانے والی کمپنی امریکن گرل (American Girl) ہر سال ایک گڑیا کسی ایسی بچی کی بناتی ہے جس نے جدوجہد کرکے مشکلات پر فتح پائی ہو۔ 2014 میں کمپنی نے بیل پالمر (Ezabel Palmer) کی کہانی سے اخذ کی گئی لڑکی کو گڑیا کی شکل میں پیش کیا اس گڑیا کا نام ہے Stylish Dancer Girl of the year 2014 Doll. اس سال میلیشا شانگ نے جو پنسلوینیا (Pensilvenia) کی رہنے والی ہے اور پیدائشی معذور ہے اس نے امریکن گرل کمپنی کو خط لکھا ہے کہ کمپنی اس کی طرح دکھائی دینے والی گڑیا بنائے۔

میلیشا دن بہ دن کمزور ہوتی جا رہی ہے پھر بھی ہمیشہ خوش رہتی ہے۔ کمپنی نے اس کا خط ملنے پر طے کیا ہے کہ وہ میلیشا کی خواہش کا احترام کرے گی اور وہیل چیئر پر بیٹھی گڑیا ضرور بنائے گی۔

یقیناً اس معذور لڑکی کا پیغام تمام دنیا میں پہنچے گا کہ دکھ سک تو زندگی میں آتے رہتے ہیں۔ اصل بات ہے زندگی کو قرینہ سے جینا۔

غیر ممالک میں ملک کی مشہور شخصیات خصوصاً راجہ رانی پر بڑی تعداد میں گڑیا بنائی جاتی ہیں۔ ان گڑیوں میں شاہی خاندان کے افراد اپنی روایتی پوشاک میں ہوتے ہیں۔ ان کی شبیہہ کو گڑیا کی شکل دینے میں ان کے وقار کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

مصر میں وادی نیل سے 1000 ق م کی گڑیاں برآمد ہوئی جو لکڑی کی بنی ہوئی تھی اور پتوار کی شکل میں تھی۔ ان کے بال مٹی کی گولیوں کو چپکا کر بنائے گئے تھے۔

مصر کے اہرام میں مختلف رنگ وروپ کی گڑیائیں برآمد ہوئیں۔ جیسے باورچی رقاصہ، حجام، موسیقار مسخرہ وغیرہ کی.... مصریوں کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد بادشاہوں کو ان سب کی ضرورت پڑے گی۔

یونان میں پانچویں صدی قم کی گڑیائیں برآمد ہوئیں۔ وہ کپڑے کی بنی ہوئی تھیں۔ اور ان کے اعضا کو حرکت دی جاسکتی تھی۔

روم میں دھات سے گڑیا بنائی جاتی تھی اور زیادہ بہتر ہوتی تھیں۔لڑکیاں، شادی سے پہلے اپنی گڑیا Diman (شکار کی دیوی) کی نذر کردیتی تھیں۔

فرانس کی گڑیا خوبصورت ،فیشن ایبل اور تمام دنیامیں مشہور ہیں۔

ہنگری میں چیڑ کے پھول اور پودوں کے ریشے سے گڑیا بنائی جاتی ہے۔آنکھیں جائی (جَو کی طرح کا اناج) سے اور ناک مکے کے دانے سے بنائی جاتی ہے۔

چلّی میں گڑیا تاروں سے بنتی ہے۔ تاروں پر رنگین دھاگے لپیٹ دیے جاتے ہیں۔

پیرو میں لکڑی کی گڑیا مقبول ہے۔

ہالینڈ کی Flander Babeis بہت مشہور ہیں۔

جرمنی میں نوریم برگ Nooremburg گڑیوں کے لیے مشہور ہے۔ یہاں کی گڑیوں کے مکانات بھی فن کاری کا عمدہ نمونہ ہوتے ہیں۔

انگلینڈ، ہالینڈ اور جرمنی میں Doll Museanm واقع ہیں۔

انگلینڈ کی مہارانی کے پاس تمام دنیا کی گڑیوں کا ذخیرہ ہے۔ انہوں نے اپنی وزارت کی اہم خواتین کے نام پر گڑیوں کے نام رکھے ہیں۔

اوراب ملتے ہیں اس گڑیا سے جس کا نام آج ہر ملک میں ہے۔ ہر بچی ربچے کی زبان پر ہے یعنی گڑیوں میں گڑیا، باربی گڑیا(Barby Doll) آج بازبی دنیا کی سب سے زیادہ مقبول

گڑیا ہے۔بچّ آوَباربی سے تعارف حاصل کرتے ہیں۔

باربی کا پورانام باربی ملی سینٹ رابرٹس Barby Mili Cent Roberts ہے اس کے والد کا نام روتھ ہینڈر ہے۔ 1950 میں دوسری جنگ عظیم کے بعد روتھ کے مشاہدے میں آیا کہ گڑیا سے کھیلنے والے بچے اپنی گڑیوں کو نئے نئے لباس پہناتے رہتے ہیں،یعنی بدلتے وقت کے ساتھ نیا فیشن نئے لباس، روتھ ہینڈلر نے ماڈرن لباس والی گڑیا بنائی۔

روتھ کی بیٹی باربی گڑیوں کی شوقین تھی اوراپنی گڑیوں کو نت نئے لباس پہنائے رہتی تھی۔ اس کا نام باربی تھا۔ روتھ نے نئی گڑیا کو باربی نام دیا۔ پہلی باربی گڑیا تین ڈالر میں فروخت ہوئی تھی۔ پھر روتھ کو ایک کمپنی مےٹیل (Metale) کا ساتھ مل گیا۔ اس کمپنی نے نیویارک کے ایک میلے میں باربی کو نوخیز ماڈل کی شکل میں متعارف کیا۔ ایسی خوبصورت گڑیا پہلے کبھی مارکٹ میں نہیں آئی تھی۔ بچوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ باربی کی مارکٹ ویلیو آسمان کو چھونے لگی۔

باربی کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے کمپنی نے اس کے پورے خاندان کو اس کے ساتھ پیش کرنا شروع کیا۔ باربی کی چار بہنیں تھیں۔ اسکپو اسٹیسی، کیلی اور کیریسی۔ 1995,1992,1964 اور 1999 سے انہیں بھی باربی کے ساتھ پیش کیا جانے لگا۔ یہی نہیں باربی کے ساتھ 21 کتے 14 گھوڑے 3 ٹٹو، 6 بلیاں اور ایک ایک توتا، چمپانزی، زراف اور شیر کا بچہ بھی رہتے ہیں۔

وقت کے ساتھ باربی شادی کی عمر کو پہنچی تو کمپنی نے 1961 میں باربی کے ایک بوائے فرینڈ گڈے کو بھی متعارف کروادیا۔

باربی گڑیا ایک فیشن ماڈل کی حیثیت سے دنیا والوں سے روشناس ہوئی تھی مگر وقت کے ساتھ اس کا ہیئر اسٹائل بدلتا اور نئے فیشن کا لباس بھی جسم پر سج جاتا۔

1970 میں وہ کیلی فورنیا گرل (Colifornia Girl) بن کر سامنے آئی۔

1980 میں ایروبک انسٹرکٹر (aerobic Instructor) یا وراکیزیکیوٹیو بنی تو نازک اندام دوشیزہ کی اپنی شناخت بھی قائم رہی 1990 میں خواتین کھلاڑیوں کی فہرست میں شامل ہوئی۔

2000 میں وہ گولڈ میڈل جیتنے والی تیراک گڑیا بن کر سب کے دلوں پر چھا گئی۔

باربی گڑیا نے اب تک 90 کیریئر میں خود کو پیش کیا ہے۔ اسے کئی ملکوں کی قومیت حاصل ہے۔ باربی 150 ملکوں میں مقبول ہے۔

اپنی 47 سالہ زندگی میں باربی راشٹرپتی عہدے کی امیدوار رہ چکی ہے۔ ویمنس ورلڈ کپ ساکر (Wones world cup soccer) کی کھلاڑی رہ چکی ہے۔ وہ ایک راک بینڈ کی ممبر بھی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تمام دنیا میں ہر تین سکینڈ میں ایک باربی گڑیا فروخت ہوتی ہے۔ بھارت میں باربی سب سے زیادہ فروخت ہونے والی گڑیا ہے۔ بھارتیہ تہذیب کے عین مطابق وہ یہاں ساڑی میں ملبوس نظر آتی ہے۔ علاقائی جیسے پنجابی، گجراتی لباس میں بھی نظر آتی ہے۔ اس کے ماتھے پر بندیا ہوتی ہے۔

وقت کے ساتھ باربی لیپ ٹاپ استعمال کرنے لگی ہے۔

وہ کئی ویڈیو گیمس جیسے Barby Magic barby fashion designer barby explorer hair style میں نظر آتی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ گڑیا بنانے کے فن پر زیادہ توجہ نہ دے کر ہم بھارتیہ اپنے ایک قابل قدر فن کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ بھارت کی مختلف کلائیں (فنون) ہمیشہ سے دوسرے ملکوں میں قابل تعریف رہی ہیں دوسرے بھارتیہ سنسکرتی بھی غیر ملکوں میں احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی رہی ہے۔ قابل تقلید رہی ہے۔ بھارت کی گڑیا غیر ممالک میں بھارت کی سماجی اور تہذیبی زندگی کی نمائندگی کرتی تھی آج وہ سب کم ہوتا جارہا ہے۔

Dr. Bano Sartaj
Opposite Akashwani, Civil Lines
Chandrapur - 442401

چوتھی قسط

اُلٹا درخت

کرشن چندر

اب تک آپ نے پڑھا کہ ایک موچی کا تھوڑا سا بے وقوف مگر منھ پھٹ اور بے روزگار بیٹا یوسف اپنی ماں کے کہنے پر بادشاہ کے پاس کام مانگنے گیا تو ہکلے اور ظالم بادشاہ نے اس کے خوب صورت باغیچے پر ہی قبضہ کرلیا۔ وہاں ایک نک چڑھی شہزادی ملی۔ اس نے یوسف کی ماں کا کنواں چھین لیا۔ اب غریب یوسف کے پاس ماں کے علاوہ ایک جھونپڑی اور ایک گائے رہ گئی۔ ماں نے کہا گائے بیچ دو ورنہ بھوکے مر جائیں گے۔ بازار میں ایک شخص نے اسے صرف تین بیج دے کر گائے لے لی اور کہا یہ بیج ایک ساتھ بوئے گا تو ایک ایسا درخت اگے گا جس کی اونچائی آسمان تک ہوگی۔ ان میں سے

دو بیج ضائع ہو گئے۔ یوسف بڑا پریشان ہوا اور اس نے بچا ہوا بیج باغیچے کی زمین میں دبا دیا۔ رات کو خوب بارش ہوئی اور صبح اٹھا تو اس نے دیکھا کہ بیج والی زمین میں ایک عجیب درخت اگا تھا جس کی جڑیں زمین پر تھیں اور تنا اور شاخیں زمین کے اندر اتر رہی تھیں۔ ماں کے منع کرنے پر بھی یوسف اس درخت پر نیچے کی طرف چڑھنے لگا۔ کافی نیچے اترنے پر وہ آوازوں کے ایک شہر میں پہنچ گیا۔ ایک سرگوشی جیسی آواز نے اسے شہر کی کہانی سنائی اور بتایا کہ یہاں تمام آوازوں کو آسمان جتنے اونچے گنبد میں قید کر لیا گیا ہے۔ مگر ان قیدی آوازوں نے وہاں سے بادشاہ کے محل تک ایک سرنگ بنائی اور اس میں فتیلہ بن کر گھس گئیں۔ یوسف کا کام تھا اس فتیلے کو آگ لگانا۔ اس نے فتیلے کو آگ دکھائی اور تیزی سے الٹے درخت پر جا پہنچا۔ کچھ ہی دیر میں آوازوں کا شہر تباہ ہو گیا اور یوسف درخت پر نیچے چڑھنے لگا۔ تین دن تین رات چڑھنے کے بعد اندھیرے میں کسی نے اسے درخت سے اتار لیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اسے اپنی مٹھی میں دبائے ہوئے ہوا میں اڑ رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس ہاتھ نے اسے ایک بہت بلند اور بڑے دروازے پر اتار دیا۔ یہ دروازہ اتنا بڑا تھا کہ ایک دیو بھی اس کے نیچے سے آسانی سے نکل سکتا تھا۔ یوسف تو خیر آدمی تھا۔ بڑی آسانی سے اندر چلا گیا۔ دروازے کی محراب پر لکھا تھا: کالے دیو کا شہر۔ یوسف درخت پر چڑھتا یا یوں سمجھ لو کہ زمین کے اندر اترتا چلا گیا جہاں ہر منزل پر اسے ایک نئی دنیا ملی...

جادوگروں کا الیکشن

سامنے بہت سے لوگ رنگ برنگی جھنڈیاں ہلاتے ہوئے جا رہے تھے۔ یوسف موہن اور شہزادی بھی ان لوگوں کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ مجمع زور زور سے نعرے لگا رہا تھا۔ ''الہ دین کو ووٹ دو۔ جو الہ دین کو ووٹ نہیں دے گا۔ وہ ملک کا غدار ہوگا۔ الہ دین زندہ باد۔''

مجمع اس طرح نعرے لگاتا ہوا جھنڈیاں ہلاتا ہوا شہر کے ایک بڑے چوک میں پہنچا۔ یوسف نے دیکھا لوگ بھوکے نظر آ رہے ہیں، ان کے کپڑے بوسیدہ اور تار تار ہیں۔ مگر پھر بھی وہ خوش نظر آ رہے ہیں۔

یوسف نے پوچھا ''بھئی کیا ماجرا ہے؟''

ایک آدمی نے حیرت سے دیکھا ''ساری دنیا کو معلوم ہے اور تمہیں معلوم نہیں؟ آج جادوگروں کا الیکشن ہے۔ وہ دیکھو سامنے الہ دین اپنا چراغ ہاتھ میں لئے الیکشن لڑ رہا ہے۔''

یوسف نے دیکھا۔ واقعی بڑے بڑے رنگارنگ جھنڈوں کے درمیان الہ دین کھڑا تقریر کر رہا تھا۔

الہ دین کہہ رہا تھا ''بھائیو اور بہنو! میں بھی تمہاری طرح ایک معمولی آدمی ہوں۔ میں ایک درزی کا بیٹا ہوں۔ میں تمہارے دکھ درد پہچانتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم لوگ بھوکے ہو، غریب ہو، تمہارے جسم پر کپڑے نہیں ہیں۔ بچوں کے لیے تعلیم نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے پچھلی حکومت نے تمہارے لیے کچھ نہیں کیا۔ مگر وہ سونے کے دیو کی حکومت تھی۔ میں درزی کا بیٹا ہوں۔ میں تمہارے سب دکھ درد دور کروں گا۔ اپنے اس جادو کے چراغ کی مدد سے میں تمہارے لیے ہر طرح کے عیش کا سامان مہیا کروں گا۔ دیکھیے میرے جادو کے چراغ کے

کرشمے۔''

یہ کہہ کر الہ دین نے جادو کے چراغ کو اپنی ہتھیلی سے رگڑا۔فوراً ایک جن ہوا میں اڑتا ہوا نظر آیا، اور ہوا ہی میں کھڑا ہو کر کہنے لگا''الہ دین کیا ارشاد ہے؟''

الہ دین نے کہا''میں شہر کے بے گھر لوگوں کے لیے عالی شان محل بنانا چاہتا ہوں۔ذرا ایک محل لا کے دکھا دو۔''

جن نے سر جھکایا اور غائب ہوگیا۔ دوسرے لمحے وہی جن اپنے ہاتھ میں ایک عالی شان سات منزلوں والا چمکتا ہوا محل لیے حاضر ہوا۔لوگوں کی نگاہیں اس خوب صورت محل کی طرف کھنچتی چلی گئیں۔محل کے دروازے کھلے تھے۔کھڑکیاں کھلی تھیں محل کے اندر روشنیاں جگ مگ جگ مگ کر رہی تھیں۔ اندر کمروں میں باجے بج رہے تھے۔خوب صورت قالین اور صوفے بچھے ہوئے نظر آرہے تھے۔لمبی لمبی، میزوں پر طرح طرح کے پھل چنے ہوئے تھے۔مرغن کھانے، بھنے ہوئے مرغ پلاؤ، متنجن، زردے، قورمے، طرح طرح کی سبزیاں، فالودے، فیرنیاں، شربت، آئس کریم گھومتی ہوئی میزوں پر رکھی ہوئی لوگوں کو نظر آرہی تھیں۔ لوگوں کی رال ٹپکنے لگی۔لاکھوں گلوں سے آواز آئی۔

''الہ دین کو ووٹ دو۔ الہ دین زندہ باد۔ ایک ووٹ، ایک ملک۔ایک الہ دین، ایک چراغ!''

یکا یک الہ دین نے تالی بجائی۔ جن اپنے محل سمیت غائب ہوگیا الہ دین نے کہا''پہلے مجھے ووٹ دو۔ پھر یہ محل تمھیں ملے گا۔'' لوگ دھڑا دھڑ ووٹ دینے کے لیے جانے لگے۔یکا یک دوسری طرف سے آواز آئی۔

''لوگو! بیوقوف نہ بنو۔ یہ الہ دین کا بیٹا تمھیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ اصلی جادو تو میرے پاس ہے۔ جادو کی ٹوپی۔ سلیمانی ٹوپی''لوگوں کا مجمع دوسری طرف پلٹ پڑا۔ایک بہت بڑے بینڈ باجے کے ساتھ، ایک بہت بڑے چبوترے پر، دو درجن لاؤڈ اسپیکروں کے سامنے ایک جادوگر سلیمانی ٹوپی ہاتھ میں لیے تقریر کر رہا تھا۔

یوسف موہن اور شہزادی بھی ادھر چلے گئے۔وہ کہہ رہا تھا۔''الہ دین ٹھگ ہے، اسے ہرگز ووٹ نہ دینا۔الہ دین کا چراغ پرانا ہو چکا ہے۔اس کا جن بھی بڈھا ہو چکا ہے۔اتنے دنوں سے وہ تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکا، اب کیا کرے گا؟ اب کے تم مجھے ووٹ دو، کیونکہ میرے پاس سلیمانی ٹوپی ہے۔ یہ ٹوپی

میں نے بڑی مشکل سے حاصل کی ہے۔ ہزاروں تکلیفیں سہہ کے اپنی جان کی بازی لگا کے، بڑی مصیبتوں کے بعد میں نے اس ٹوپی کو حاصل کیا ہے۔''

موہن نے کہا ''اس ٹوپی میں کیا خاص بات ہے؟ مجھے تو سیدھی سادھی سفید رنگ کی ٹوپی دکھائی دیتی ہے۔''

جادوگر نے موہن کی بات سن لی۔ وہ وہیں اپنے چبوترے سے چلا کر بولا ''یہ کوئی معمولی ٹوپی نہیں ہے، اسے پہن کر آدمی یوں غائب ہو جاتا ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ دیکھو

دیکھو سلیمانی ٹوپی کا کمال دیکھو۔'' یہ کہہ کر جادوگر نے سلیمانی ٹوپی پہن لی اور موہن یوسف مجمع کے درمیان سے یکا یک غائب ہوگیا۔ اب صرف اس کی آواز آرہی تھی۔

''دیکھا، یہ سلیمانی ٹوپی کا کمال ہے۔ اسے پہن کر آدمی غائب ہوسکتا ہے۔''

جادوگر نے اپنے سر سے ٹوپی اتار دی اور اب وہ لوگوں کو نظر آنے لگا۔

''اس ٹوپی کو پہن کر آدمی غائب ہوسکتا ہے۔ جہاں چاہے گھوم سکتا ہے۔ وہ ساری دنیا کی سیر کرسکتا ہے۔ وہ جہاں چاہے بغیر ٹکٹ کے جاسکتا ہے، اور اسے کوئی ٹوکنے والا نہیں۔ اس ٹوپی کو پہن کر آدمی بڑے بڑے راز معلوم کرسکتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کے بڑے بڑے راز۔ وہ اونچی سے اونچی سوسائٹی میں جاسکتا ہے اور کوئی اسے ٹوک نہیں سکتا۔ اس ٹوپی کو پہن کر آدمی وزیر بن سکتا ہے۔ نوکری حاصل کرسکتا ہے۔ یہ سلیمانی ٹوپی ہے اس کے سامنے الہ دین کا چراغ بالکل ہیچ ہے۔ اسے رگڑنے کی ضرورت نہیں۔ کسی جن کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ بس اسے سر پر پہن لیجیے آپ کے سب کام پورے ہو جائیں گے۔ پھر الہ دین کے پاس ایک ہی چراغ ہے۔ لیکن میں نے سب کے فائدے کے لیے ہزاروں سلیمانی ٹوپیاں تیار کرائی ہیں۔ یہ بنڈل کے بنڈل جو آپ چبوترے پر دیکھ رہے ہیں۔

یہ سب سلیمانی ٹوپیاں ہیں۔ آیئے! مجھے ووٹ دیجیے، اور یک سلیمانی ٹوپی لیتے جایئے۔ ایک ووٹ، ایک سلیمانی ٹوپی۔''

لوگ دھڑا دھڑ ووٹ دینے کے لیے بھاگنے لگے اور شور مچانے لگے۔ ''سلیمانی ٹوپی زندہ باد۔ الہ دین کا چراغ مردہ باد۔''

''ہاہاہا'' تیسرے چبوترے سے ایک زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ سب لوگ ادھر دیکھنے لگے۔ وہاں ایک اور جادوگر سر پر سفید کاغذ کی ٹوپی رکھے، سفید کاغذ کا کوٹ پہنے، آنکھوں پر چشمہ لگائے ہاتھ میں اخبار لیے ہوئے ہنس رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

''دوستو! یہ سلیمانی ٹوپی والا بہروپیا ہے، بہروپیا۔ یہ خود تو ووٹ لے کر غائب ہو جائے گا، اور آپ کو کپڑے کی ٹوپیاں دے جائے گا۔ چاہے آپ ان کو سر پر پہنیے۔ چاہے تھیلا بنا کر گھر لے جایئے۔ دوستو یہ سلیمانی ٹوپی کس کام کی؟ غائب ہو کر آپ کیا کریں گے؟ اگر آپ کو اس جادو کی دنیا میں رہنا ہے تو سچا جادو تلاش کرنے کی کوشش کیجیے، اور سچے جادوگر کو اپنا بادشاہ

بنایئے۔ مجھے دیکھیے، میرا جادو کسی کو غائب نہیں کرتا۔ کوئی ہوائی محل نہیں دکھاتا۔ میں ابھی آپ کے سامنے وہ چیز رکھتا ہوں جس کی آپ کو ضرورت ہے۔''

جادوگر نے انگلی سے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا ''کہو تم کیا چاہتے ہو؟'' ''مجھے اپنی زمین میں کنواں چاہیے۔''

جادوگر نے اپنے چبوترے پر پڑے کاغذ کے انبار میں سے ایک بڑا سا کاغذ نکالا اور اس پر کچھ منتر پڑھ کے پھونکا اور اس آدمی کو دیا۔ اسے اس کاغذ پر اپنے کھیتوں کی تصویر نظر آئی۔ کھیت بنجر پڑے تھے۔ یکا یک اسے بیچ میں ایک کنواں نظر آیا۔ کنویں پر رہٹ چلنے لگا۔ پانی فوارے کی طرح نکل کر کھیتوں کو سیراب کرنے لگا۔ آدمی کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اس نے دیکھا اس کے جھونپڑے سے اس کی بیوی نکلی پانی کا گھڑا لیے ہوئے۔ بیوی نے مسکرا کر خاوند کی طرف دیکھا اور خاوند اسی وقت وہ کاغذ ہاتھ میں لے کر اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ وہ بھاگتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔

''مجھے مل گیا، میرا کنواں مجھے مل گیا۔''

''تمہیں کیا چاہیے؟'' جادوگر نے ایک دوسرے آدمی سے پوچھا۔

اس آدمی نے کہا ''ہمارے قصبے میں کوئی اسکول نہیں ہے۔''

جادوگر نے ایک دوسرا پرزہ کاغذ کا اٹھایا اور اس پر منتر پڑھ کر پھونکا اور پھر وہ پرزہ کاغذ کا اس آدمی کے ہاتھ میں دے دیا۔

اس آدمی نے غور سے اس کاغذ کی طرف دیکھا جہاں اس کا گھر تھا اس کے بالکل قریب ایک نئی اور خوبصورت اسکول کی بلڈنگ کھڑی تھی۔ بچے کتابیں ہاتھ میں لیے جا رہے تھے۔ ایک خوبصورت باغیچے میں بچے کھیل رہے تھے۔ یکا یک اسکول کے گیٹ پر اسے اپنے دو بچے نظر آئے۔ وہ دونوں ہاتھ ہلا کر اسے ہیلو پاپا، کہنے لگے۔ آدمی اسی وقت وہ کاغذ اپنے ہاتھ میں لے کر وہاں سے بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے کہہ رہا تھا وہ ''ہمیں اسکول مل گیا، ہمیں اسکول مل گیا۔''

پھر کیا تھا۔ مجمع جادوگر پر ٹوٹ پڑا۔

ایک بولا ''مجھے جوتا چاہیے۔''

جادوگر نے اسے کاغذ کا پرزہ دیا۔

دوسرا بولا ''مجھے موٹر چاہیے۔''

جادوگر نے اسے کاغذ کا پرزہ دیا۔

تیسرا بولا ''ہمیں اپنے گاؤں میں ایک ہسپتال چاہیے، ایک اسکول ایک نہر، ایک تھیٹر چاہیے۔''

جادوگر نے اسے ایک کاغذ کا پرزہ دیا۔

موہن نے یوسف سے کہا ''تمہیں کاغذ پر کچھ نظر آتا ہے؟''

یوسف نے کہا ''مجھے تو سفید کاغذ ہی نظر آتا ہے۔''

موہن نے کہا ''ممکن ہے ان لوگوں کو کچھ نظر آتا ہو لیکن اگر مان لیا جائے کہ انہیں کچھ نظر آتا ہے تو آخر کاغذ پر ہی نظر آتا ہے نا۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟''

یوسف نے اس آدمی کو بازو سے پکڑ لیا۔ جس نے جادو سے جوتا مانگا تھا اور اس سے پوچھا۔ ''تمہیں جوتا مل گیا؟''

اس آدمی نے بڑے غصے سے کاغذ کا پرزہ یوسف کے منہ کے سامنے لا کر کہا '' دیکھتے نہیں ہو، مل گیا ہے، یہ دیکھو۔''

یوسف کو سفید کاغذ ہی نظر آیا۔

یوسف نے کہا ''اگر یہ جوتا ہے تو اسے پہن کر دکھاؤ۔''

اس آدمی نے کاغذ کے ٹکڑے کو اپنے پاؤں میں پہننے کی کوشش کی۔ کاغذ اسی وقت بیچ سے پھٹ گیا۔ چرر کی آواز سنتے ہی جادوگر زور سے گرجا۔ ''کون ہے؟ کون حقیقت پسند گھس آیا ہے ہماری جادو کی دنیا میں۔ اسے جلدی نکالو۔ ورنہ یہ سب کچھ تباہ کر دے گا۔ ہمارا جادو سب ختم ہو جائے گا۔'' اتنا سنتے ہی الہ دین چراغ والا، سلیمانی ٹوپی والا، جادو کے کاغذ والا اور ان کے حمایتی، یوسف موہن اور شہزادی کے پیچھے بھاگے۔

وہ تو خیر ہوئی کہ یوسف نے بڑی چالاکی سے کام لیا۔ اس نے جلدی سے سلیمانی ٹوپیوں کے بنڈل سے تین ٹوپیاں نکالیں اور انہیں پہن کے مجمع کے بیچ میں سے غائب ہو گئے۔ ورنہ اتنا بڑا مجمع ان کے پیچھے پڑ جاتا تو ان کی ہڈی پسلی بھی نہ بچتی۔

ہانپتے ہانپتے تینوں جادو کی دنیا کے دروازے سے باہر آ گئے۔ باہر چاندی کا دیو بیٹھا چار آنے کے ٹکٹ بیچ رہا تھا۔ انہیں واپس آتے دیکھ کر بڑی عاجزی سے کہنے لگا۔

''تمہارے پاس کھانے کو کچھ ہے؟ تین سو سال سے بھوکا بیٹھا ہوں۔ میرے حال پر رحم کھاؤ اور کچھ کھانے کو دو۔''

یوسف اور موہن اور شہزادی نے سلیمانی ٹوپیاں دیو کے ہاتھ میں تھما دیں اور کہا '' ان تینوں ٹوپیوں کو ہلا کر پہن لو۔ پھر تمہیں سب کچھ مل جائے گا۔''

☆☆☆

جادو کی دنیا میں چونکہ انہیں کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا۔ اس لیے موہن، یوسف اور شہزادی تینوں بھوکے تھے، اور شہزادی تو بہت ہی بھوکی تھی کیونکہ اسے رلانے کے لئے خاص طور پر بھوکا رکھا گیا تھا۔ اس لیے تینوں جادو کی دنیا سے واپس آتے ہی درخت سے پھل توڑ توڑ کر کھانے لگے۔ کھاتے کھاتے موہن نے شہزادی سے پوچھا۔

''تم کس ملک کی شہزادی ہو؟''

شہزادی نے کہا '' میں تو سرے سے شہزادی ہوں ہی نہیں۔ میں تو ایک ڈبل روٹی بیچنے والے کی لڑکی ہوں۔''

''ہائیں! شہزادی نہیں ہو؟'' موہن نے حیرت سے کہا ''مگر وہ تمہیں بیچنے والا تو...؟''

''قصہ یہ ہے'' شہزادی نے کہا ''شہر میں میرے باپ کی ایک چھوٹی سی دوکان تھی، جہاں وہ ڈبل روٹیاں پکایا کرتا تھا۔ میرا باپ، میری ماں اور میں، ہم تینوں خمیری آٹا گوندھتے تھے۔ اسے ڈبل روٹی کے سانچے میں بھر کر چولہے میں پکاتے تھے۔ خمیرا اٹھانا اسے سانچے میں ڈالنا سانچے کو آگ میں بس اتنی دیر رکھنا کہ روٹی ٹھیک پک جائے، نہ کم زیادہ بہت مشکل کام ہے۔ پکتی ہوئی ڈبل روٹیوں کو باہر نکالنا اور تازہ روٹیوں کو چولہے میں رکھنا بھی بڑا مشکل کام ہے، اور میں چھوٹی سی تھی میں کھیلنا چاہتی تھی جبکہ مجھے کام کرنا پڑتا تھا۔ ایک دن کیا ہوا کہ میری ماں بیمار ہو گئی۔ اب مجھے اور میرے باپ کو دوکان پر کام کرنا پڑا۔ میں نے بہت سی روٹیاں جلا ڈالیں۔ اس پر میرے باپ نے مجھے خوب پیٹا اور دوکان سے باہر نکال دیا۔ میں باہر

سڑک پر کھڑی ہو کر رونے لگی۔ اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کیا ہوا۔ میں نے اتنا دیکھا کہ ایک بڈھا میرے پاؤں پر جھکا ہوا زمین پر سے کچھ چن رہا ہے۔ بڈھا اٹھ کر کھڑا ہوا، اور میری طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دوکان میں واپس لے گیا۔

اس بڈھے نے میرے باپ سے کہا ''اس چھوٹی سی بچی کو پیٹتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی۔''

باپ نے کہا ''یہ میری بچی ہے میں اسے پیٹ سکتا ہوں، میں اس کا باپ ہوں، اسے میری دوکان پر کام کرنا ہوگا۔ مجھ پر بہت سا قرض چڑھا ہوا ہے۔ آج اس نے کئی درجن ڈبل روٹیاں جلا ڈالیں۔ اس نقصان کو کون برداشت کرے گا؟ میں یا تم؟ میں بہت غریب ہوں اور ایک وقت کا کھانا بھی بڑی مشکل سے نکال پاتا ہوں۔ اس پر تم اس کی حمایت کرنے آ گئے۔ حالانکہ پہلی بار آج میں نے اسے پیٹا ہے۔''

''اگر تم غریب ہو اور اسے پال نہیں سکتے تو اس لڑکی کو مجھے دے دو۔ میں اسے اپنی بیٹی بنالوں گا۔ اسے بہت اچھی طرح رکھوں گا۔ اسے اچھے اچھے کپڑے پہناؤں گا۔ اچھے اچھے کھانے کھلاؤں گا۔ اچھی تعلیم دوں گا، اور اچھے گھر میں رکھوں گا۔''

میرے باپ نے کہا ''اور یہاں، اس کی جگہ میری دوکان پر کون کام کرے گا؟ تم؟''

بڈھے نے کہا ''اس کے عوض میں اس دوکان کا قرضہ اپنے ذمے لیتا ہوں اور تمہیں اتنی رقم اور دئے دیتا ہوں کہ تم زندگی بھر آرام سے رہ سکتے ہو۔''

اتنا کہہ کر بڈھے نے اشرفیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی میرے باپ کے ہاتھ میں تھمادی۔ میرا باپ کبھی میری طرف دیکھتا تھا، کبھی تھیلی کی طرف۔ آخر اس نے تھیلی قبول کر لی اور بیٹی بیچ دی کیونکہ وہ بہت غریب تھا۔ پھر اس نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ چلو بیٹی اس امیر بڈھے کے گھر آرام سے رہے گی۔''

''تو تم اپنے باپ سے الگ ہو گئیں؟'' یوسف نے پوچھا۔

''ہاں!'' شہزادی نے کہا ''وہ بڈھا ایک امیر جوہری تھا۔ مجھے اپنی خوبصورت گاڑی میں بیٹھا کے اپنے گھر لے گیا۔ راستے میں اس نے مجھ سے پوچھا، کیا تم ہر روز روتی ہو؟''

میں نے کہا ''نہیں تو، میں تو ہر روز ہنستی رہتی ہوں۔ آج پہلی بار روئی ہوں۔''

ہوں۔ یہ کہہ کر بڈھا کچھ سوچنے لگا۔ گھر لے جا کے بڈھے نے مجھے بڑے آرام سے رکھا۔ اچھے اچھے کھانے، خوب صورت کپڑے اور سیر کے لیے چار گھوڑوں والی گاڑی۔ اس کے گھر میں ہر طرح کا آرام تھا۔ بس ایک نقص تھا۔''

''وہ کیا؟'' موہن نے پوچھا۔

''بڈھا روز رات کے کھانے کے بعد مجھے پیٹتا تھا۔ میں روتی چیختی چلاتی تو وہ گراموفون بجانے لگتا۔ تاکہ میری آواز باجے کی آواز میں دب جائے۔ یہ سلسلہ کوئی ایک یا آدھ گھنٹہ تک جاری رہتا۔ جب تک میں رو رو کر تھک نہ جاتی۔ بڈھا چین سے نہ بیٹھتا وہ مجھے رلاتا اور میری آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسوؤں کے موتیوں کو ایک ریشمی رومال میں چن لیتا اور پھر اپنی دوکان پر لے جا کر سجا دیتا۔

گاہک موتیوں کو دیکھ کر بہت حیران ہوتے کیونکہ کسی جوہری کی دوکان پر ایسے خوب صورت موتی نظر نہ آتے تھے۔ وہ ایسے سفید شفاف اور چمکتے ہوئے موتی تھے کہ سمندر کے موتی ان کے سامنے بالکل جھوٹے معلوم ہوتے تھے۔ ہوتے ہوتے یہ خبر بادشاہ تک پہنچی۔ بادشاہ نے جوہری کے موتیوں

کو پرکھا اور دیکھتا رہا۔ اس کو بھی اچھے اچھے موتیوں جواہرات اور دوسرے قیمتی پتھروں کو جمع کرنے کا شوق تھا۔ ہر بادشاہ کو نایاب چیزیں جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ کوئی پتھر جمع کرتا ہے۔ کوئی ٹکٹیں جمع کرتا ہے، خیر تھوڑی دیر تک موتیوں کو دیکھنے کے بعد بادشاہ نے جوہری سے کہا۔

''یہ موتی تم کہاں سے لاتے ہو؟''

جوہری نے دوچار دفعہ جھوٹ بولنے کی کوشش کی مگر بادشاہ بہت چالاک تھا اس نے جوہری سے کہا۔

''سچ سچ بتاؤ یہ موتی کہاں سے حاصل کیے ہیں ورنہ قتل کرادیے جاؤ گے، بادشاہ نے جلاد کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔

جوہری تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر اور گڑگڑا کر اپنی جان بخشی کی درخواست کی اور کہا'' حضور! یہ موتی سمندر کے نہیں ہیں۔ یہ موتی ایک ڈبل روٹی بیچنے والی لڑکی کے آنسو ہیں۔''

بادشاہ کو یقین نہیں آیا، مگر جوہری کے بار بار کہنے پر بادشاہ کو ماننا پڑا۔ اس نے جوہری سے کہا'' جاؤ اسے فوراً دربار میں پیش کرو۔ چنانچہ میں دربار میں لائی گئی اور بادشاہ کے سامنے رلائی گئی۔

بادشاہ مجھے روتے دیکھ کر بہت خوش ہوا کیونکہ واقعی میرے آنسو پلکوں سے گرتے ہی موتی بن جاتے تھے اور جیسا کہ میں نے ابھی کہا بادشاہ کو بھی قیمتی پتھر جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے جوہری کو قتل کرادیا اور مجھے اپنے محل میں رکھ لیا، اور میرے کمرے کے چاروں طرف پہرہ لگا دیا۔

بادشاہ کے محل میں مجھے دن میں ایک بار نہیں، چار چار بار رلایا جاتا تھا، کیونکہ وہ بادشاہ اپنے قریب کے ایک دوسرے ملک پر چڑھائی کرنا چاہتا تھا اور چڑھائی کے لئے فوج کی اور فوج کے لیے سامان اور روپے کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے میرے آنسو کام میں لائے گئے، اور جب بادشاہ کا خزانہ موتیوں سے بھر گیا، تو اس نے دوسرے ملک پر چڑھائی کردی۔ اتفاق کی بات کہ بادشاہ کو بری طرح شکست ہوئی اور دوسرے ملک والوں نے بادشاہ کی راجدھانی پر حملہ کردیا۔ خوب لوٹ مار ہوئی۔ بادشاہ کا محل بھی لوٹا گیا۔ میں اس لوٹ میں ایک سپاہی کے ہاتھ آئی۔ اس نے مجھے ایک چھوٹی سی لڑکی سمجھ کر دس اشرفیوں کے عوض ایک سوداگر کے ہاتھ فروخت کردیا جو غلاموں کی تجارت کرتا تھا۔ آگے جو کچھ ہوا وہ تم سب جانتے ہو۔''

یوسف نے موہن سے کہا'' چلو بھئی! اب آگے بھی بڑھو گے یا کہانیاں ہی سنتے رہو گے۔''

یوسف، موہن اور شہزادی تینوں درخت پر چڑھنے لگے۔ یوسف نے موہن سے کہا'' میں آگے آگے چلتا ہوں تم میرے پیچھے پیچھے آؤ اور اے مس ڈبل روٹی۔'' یوسف نے شہزادی سے کہا'' تم ذرا موہن کی مدد کرو۔ بے چارے کے ہاتھ پر صرف ایک انگوٹھا ہے اگر تم مدد نہیں کرو گی تو یہ درخت پر چڑھ نہیں سکے گا۔''

شہزادی کو اپنا نام بہت پسند آیا۔ مس ڈبل روٹی ہنسنے لگی۔ پھر بولی'' موہن بے چارہ بھی کس قدر مجبور ہے۔''

موہن نے غصہ سے کہا'' میں اس قدر مجبور نہیں ہوں۔ اس درخت پر چڑھتے چڑھتے میرے ہاتھوں میں کھجلی ہونے لگی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرے ہاتھوں کی انگلیاں اندر ہی اندر پھر سے اگ رہی ہیں۔''

جاری...

علی بابا
اور چالیس چور
اب پڑھیے
اس کہانی کی
آخری قسط
کھل جا
سم سم!!

چالیس چوروں کا خزانہ ملنے کے بعد زندگی کس قدر آرامدہ ہو گئی ہے
ارے ارے ---
یہ کون ہے!
معافی چاہتی ہوں میرے آقا مگر مجھے کچھ تیل اُبالنا ہے
تیل اُبالنا ہے؟ کس لیے ---
آپ آرام سے سوئیے آقا، چھوٹا سا کام ہے میں کرلوں گی
غلام لڑکی مرجینا تیل اُبال کر وہاں لے گئی جہاں پیپے رکھے تھے
کیا وقت ہو گیا؟
ٹک ٹک

یہ آخری پیپا ہے۔۔۔اوہ! اُدھر کوئی آ رہا ہے
تم لوگ میرے اشارے کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ارے، یہ تو مر چکے ہیں
یہاں تو میرے سارے آدمی مر چکے ہیں۔اب مجھے بھاگنا پڑے گا
لیکن میں ہار نہیں مانوں گا۔پھر آؤں گا اور علی بابا کو تباہ کر دوں گا
علی بابا کے گھر سے بھاگ کر چوروں کے سردار نے بھیس بدلا اور علی بابا کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا
آہا۔یہ تو علی بابا کا بیٹا ہے! اس دفعہ اپنا ارادہ پورا کر کے رہوں گا

آداب عرض جناب، آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔ آپ کے یہ برتن بہت اچھے ہیں
اس کے لیے آپ کو میں یہ حقیر سا تحفہ دینا چاہتا ہوں
ابا یہ دیکھیے ایک ویاپاری نے میرے برتنوں سے خوش ہو کر یہ تحفہ دیا ہے، خوبصورت ہے نہ
بے شک یہ خوبصورت ہے تمہیں اسے رات کے کھانے پر بلانا چاہیے
اگلے روز۔۔۔
واہ، کھانے کی دعوت علی بابا کی طرف سے اتنی جلدی کامیابی کی امید مجھے نہیں تھی
میں بخوشی آپ کی دعوت قبول کرتا ہوں مگر میرے کھانے میں نمک نہ ہونا چاہیے
لو اس کا جواب آ گیا، وہ آئے گا مگر نمک نہیں کھائے گا، عجیب بات ہے!

اچھے کھانے بنواؤ مرجینا مگر یاد رہے ان میں نمک نہ ہو، ہمارا مہمان نمک نہیں کھاتا۔
نمک نہیں کھاتا، عجیب بات ہے، کسی کا نمک کھانا تو دوستی کی نشانی ہے!
آیئے آیئے
خدا کی رحمت ہو میرے میزبان
خدا کی پناہ، یہ تو نئے بھیس میں وہی چوروں کا سردار ہے، اب میں کیا کروں؟
علی بابا کے مہمان کو پہچان لینے کے بعد مرجینا نے ناچ کی محفل شروع کی
اب میں خنجر کا ناچ دکھاؤں گی

ہوں اب موقع آ گیا ہے
نشانہ چوکنا نہیں چاہیے
آہ مرجینا یہ تم نے کیا کر ڈالا
میں نے آپ کے
دشمن کا خاتمہ کر دیا آقا
یہ تم کیا کہہ رہی ہو،
صاف صاف بتاؤ

Ali Baba And The Forty Thieves سے ماخوذ/انگریزی سے ترجمہ: شبنم پروین

ننھے فنکار

فیضان خان
انگلوشناء ہائی اسکول وجونیئر کالج ناندیڑ، مہاراشٹرا

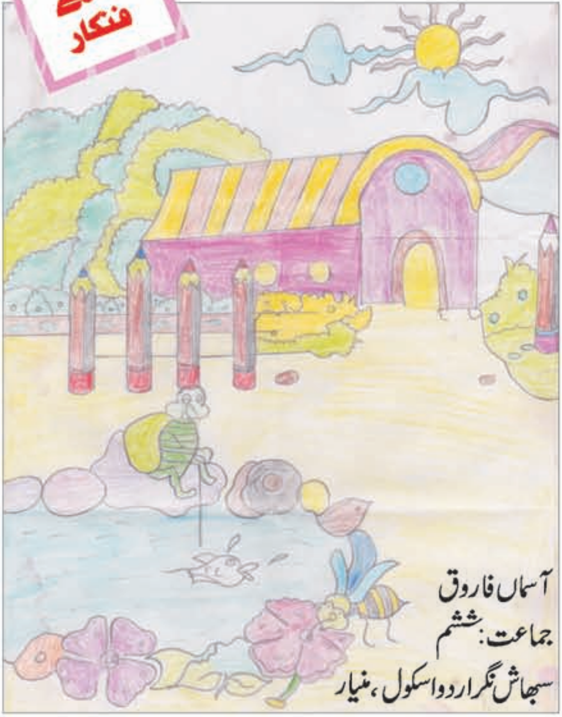

آسماں فاروق
جماعت: ششم
سبھاش نگراردواسکول، منیار

عید منائیں

نظم
بسم اللہ عدیم

دل میں خوشی کے پھول کھلائیں   ہم سب مل کر عید منائیں
دیش ہے اپنا قومی البم...،   سامنے اس کے چاند ہے مدّھم
جو ہیں پڑوسی اور شناسا   ان میں خوشی کا بانٹو تحفہ
عید سے خوش ہیں بچّے ، بوڑھے   چمک رہے ہیں ان کے چہرے
کتنا حسیں ہے آج کا منظر   دکھ کا سایہ کوئی نہ دل پر
دل کی کشادہ کرکے باہیں   آؤ نئی اک شمع جلائیں
نظم یہ اپنی سب کو سنائیں   عید ملن سب مل کہ منائیں

Bismillah Adeem
199/3-1, Jaweriwada
Santkabir Marg, Mhajna Path
Burhanpur - 450331

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

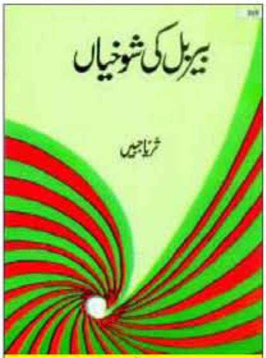

صفحات: 64، قیمت: 12 روپے

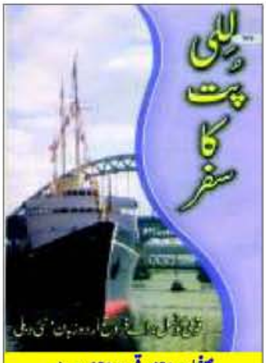

صفحات: 48، قیمت: 12 روپے

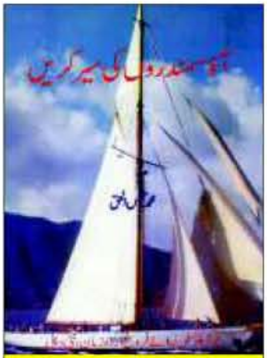
صفحات: 183، قیمت: 20 روپے

صفحات: 35، قیمت: 12 روپے

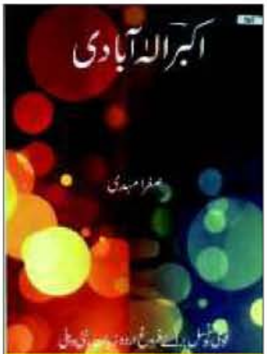

صفحات: 58، قیمت: 12 روپے

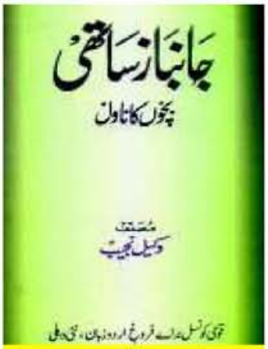

صفحات: 200، قیمت: 42 روپے

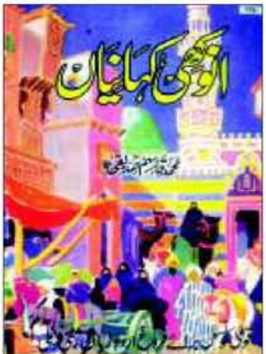

صفحات: 31، قیمت: 10 روپے

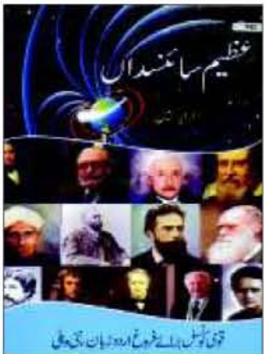

صفحات: 83، قیمت: 15 روپے

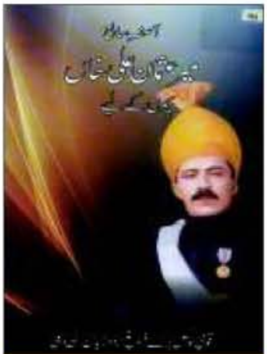
صفحات: 56، قیمت: 12 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

BACHON KI DUNIYA Monthly, September 2015, Vol. 03, Issue: 9
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India
RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439-2013-15
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/8/15
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دل چسپ کتابیں

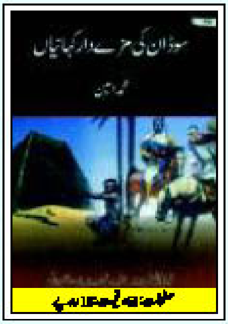
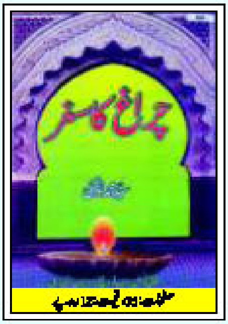

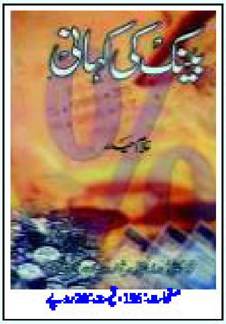

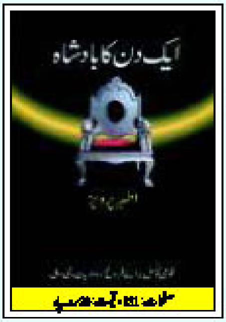

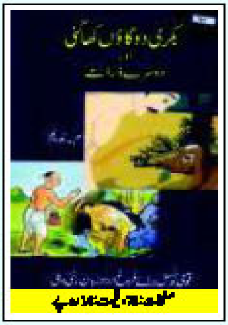
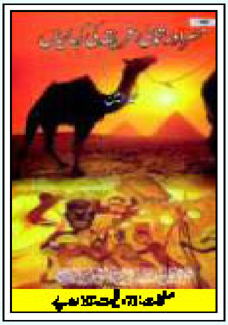
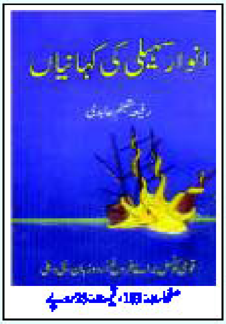
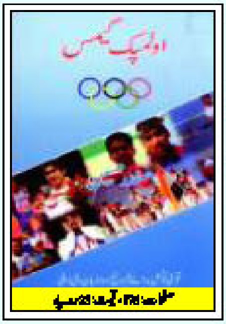

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025 and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor : Prof. Syed Ali Karim, Tel : 49539000